الرسالہ

نیا ہندستان

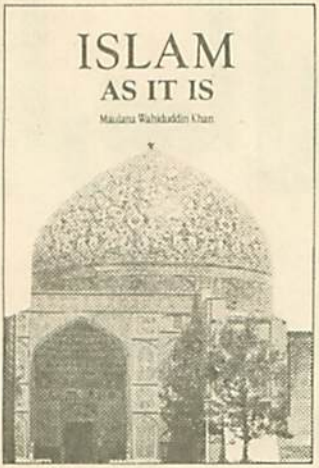
زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر، اسلامی مرکز

تاریکی جب اپنی آخری حد پر پہونچتی ہے
تو وہ روشنی کی تمہید بن جاتی ہے

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

جنوری ۱۹۹۳ □ شمارہ ۱۹۴

Rs. 6





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

نیا ہندستان

مولانا وحید الدین خاں

امید کی طرف
ایک تبصرہ
نیا ہندستان
مذہبی ہم آہنگی اور اسلام
انسانیت انتظار میں ہے
قومی اتحاد
حل کی طرف

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi - 110 013
Telephone : 697333, 611128
Fax : 91-11-3312601 (Attn : Tel. 697333)

امید کی طرف

موجودہ دنیا کا نظام کچھ فطری اصولوں پر قائم ہے۔ فطرت کے یہ اصول انتہائی حد تک اٹل ہی
ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انھیں میں سے ایک ابدی اصول، قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ اس دن
میں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر موجود رہتا ہے (انّ مَعَ العُسرِ یُسرا) یہاں ہر ناموافق واقعہ میں ایک موافق
پہلو پایا جاتا ہے۔ فطرت کا یہ اصول اتنا عام ہے کہ بدترین تخریب، حتیٰ کہ قتل جیسے حادثات بھی اس سے
مستثنیٰ نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت آدم کے بیٹوں میں سے دو بیٹوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ان ک
نام ہابیل اور قابیل تھا۔ دونوں بھائیوں کا اختلاف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی آخری شدت تک
پہونچ گیا۔ اب قابیل نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دے۔ چنانچہ اندھے انتقام
سے مغلوب ہو کر قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا ــــ اب چلتا پھرتا اور ہنستا بولتا ہابیل ایک بے جان
لاش کی صورت میں اس کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ ہابیل جب زندہ تھا تو وہ قابیل کو حریف کے روپ میں
دکھائی دیتا تھا۔ مگر جب اس نے اپنے بھائی کو خون آلود لاش کے روپ میں دیکھا تو اس کا ضمیر جاگ
اٹھا۔ اب اس کی انسانیت بیدار ہو کر اس کو ملامت کرنے لگی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان
الفاظ میں بتائی گئی ہے: فَاَصْبَحَ مِنَ النّادِمِیْنَ (المائدہ ۳۱) پھر وہ پچھتانے والوں میں سے ہو گیا۔

اس سے ایک اہم نفسیاتی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انتقام اپنی آخری حد پر پہونچ کر ندام
بن جاتا ہے۔ غصہ جب اپنی آخری کارروائی کر چکا ہوتا ہے تو اس کے بعد وہ اعتراف میں ڈھل ج
ہے۔ حیوانیت اپنا آخری روپ دکھانے کے بعد انسانیت کی طرف لوٹ آتی ہے۔

فطرت کا یہ قانون ایک قسم کا چیک (روک) ہے جو زندگی کے نظام کو درست رکھتا ہے۔ و
انتہا پسندی کو بار بار اعتدال پسندی کی طرف لے آتا ہے۔ وہ عدم توازن کو توازن کی طرف لوٹاتا رہتا
انسانیت کی گاڑی جب سیدھے راستہ سے ہٹ کر بھٹکاو والے راستہ کی طرف مڑنے لگتی ہے تو وہ ا
کو دوبارہ سیدھے راستہ پر لا کر اس کی اصل منزل کی طرف اسے رواں دواں کر دیتا ہے۔

یہ دنیا امید پر قائم ہے، مایوسی پر نہیں۔ اس دنیا کی اصل روشنی ہے، اس دنیا کی اصل تاری
نہیں۔ یہاں تاریخ زندگی کی طرف جا رہی ہے، یہاں تاریخ کبھی موت کی طرف سفر کرنے والی نہیں

ایک تبصرہ

مہاتما گاندھی کے سوانح نگار لوئی فشر (Louis Fischer) نے اپنی کتاب کے آخری باب
یہ دکھایا ہے کہ ناتھورام گاڈسے نے گاندھی جی کو کیوں قتل کیا۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ
سے اور ان کے ساتھی یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی کو اپنے راستہ سے ہٹا کر وہ مسلمانوں کو ایسی حالت
کر دیں گے کہ ان کا کوئی بچاؤ کرنے والا نہ ہوگا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ گاندھی کا قتل
نتیجہ پیدا کرے گا، کیوں کہ یہ واقعہ ملک کو بتائے گا کہ اینٹی مسلم تحریک کتنی زیادہ خطرناک ہے اور
کہاں تک جا سکتی ہے :

They wished, by removing him, to make the Moslems defenseless, little realizing that his assassination would have the opposite effect by showing the country how dangerous and undisciplined extreme anti-Moslems could be. (The Life of Mahatma Gandhi, pp. 504-505)

عملاً ایسا ہی پیش آیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوا تو اس کے ساتھ ہی ملک میں
دست مسلم دشمنی کی لہر آگئی۔ مسلمانوں کے خلاف مجنونانہ انداز میں خون آشام کارروائی شروع
ئی۔ مگر جب اس کا یہ انتہائی نتیجہ سامنے آیا کہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو اس نے خود ملک کے باپو
ا گاندھی کو پستول کی گولی سے ہلاک کر دیا تو پورا ملک سناٹے میں آگیا۔ مہاتما گاندھی کے خون
مسلم دشمنی کی آگ کو اچانک بجھا دیا۔ اور پھر چالیس سال کے لیے تاریخ کے رخ کو دوسری طرف
دیا۔

ٹھیک اسی قسم کا واقعہ دوبارہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا میں پیش آیا ہے۔ بعض اسباب نے
انتہا پسندی کو دوبارہ موقع دیا۔ وہ از سر نو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس بار اس انتہا پسندانہ تحریک کا
جودھیا تھا۔ اور عام طور پر اس نے بابری مسجد۔ رام جنم بھومی تحریک کی حیثیت سے شہرت
کی۔

یہ تحریک ابتداءً ۱۹۸۶ میں شروع ہوئی۔ جذباتی ہنگاموں کے درمیان وہ بڑھتی رہی۔
لک کہ وہ اپنے شدید ترین مرحلہ میں پہنچ گئی۔ اس کا آخری نقطۂ عروج ۶ دسمبر ۱۹۹۲ تھا جب کہ

بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد کی قیادت میں ایک لاکھ سے زیادہ انتہا پسند ہندو اجودھ
میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے ۴۶۵ سالہ بابری مسجد پر یلغار کر دی اور چند گھنٹہ کے اندر اس
کو ڈھاکر زمین کے برابر کر دیا۔

یہ بلاشبہ جدید ہندستانی تاریخ کا سیاہ ترین واقعہ تھا۔ عبادت خانہ کسی سماج میں آخ
قابل احترام چیز سمجھا جاتا ہے۔ عبادت خانہ کو گرانا گویا تمام انسانی قدروں کو ڈھا دینا ہے۔

یہ فعل پارلی منٹ کے فیصلہ کے خلاف تھا۔ وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف تھا۔
نیشنل انٹگریشن کونسل کی تجاویز کے خلاف تھا۔ وہ انڈیا کی تمام بہترین روایات کے خلاف تھ
وہ عالمی رائے عامہ کے خلاف تھا۔ وہ اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر کے خلاف تھا
کہ وہ خود متعلقہ انتہا پسند لیڈروں کے اپنے بیان کے خلاف تھا۔ غرض کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی اصو
نہیں جس کی تائید اس اقدام کو حاصل ہو۔

تمام سنجیدہ طبقوں نے بجا طور پر اس واقعہ کو ملک کے لیے انتہائی افسوس ناک اور ر
واقعہ قرار دیا ہے۔ بلاشبہ یہ اتنا زیادہ الم ناک واقعہ ہے کہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے
ہے۔ مگر دوسرے تمام حادثات کی طرح، اس حادثہ میں بھی یقیناً ایک مثبت پہلو موجود ہے۔ ا
تاریکی میں بھی روشنی کا ایک امکان جھلک رہا ہے۔

یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ یہاں امکانات کی مقدار، ہمیشہ مسائل سے زیادہ ہوتی ہے
ظلم کا کوئی بھی واقعہ اس پر قادر نہیں کہ وہ تمام امکانات کو مٹا دے۔ کسی بھی تاریکی کے لیے
ممکن نہیں کہ وہ امید کے تمام چراغوں کو بے نور کر دے۔

فطرت کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ یہاں — ظلم اپنی آخری انتہا پر پہنچ
ندامت بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سماج میں انتہا پسندی کی تحریک صرف ایک بار ا
ہے۔ اور ایک بار جب وہ اپنے آخری انجام تک پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کو دہرانا ممک
نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد فاشزم اٹلی میں دہرائی نہ جا سکی اور ا
طرح نازی ازم کو دوبارہ جرمنی میں فروغ حاصل نہیں ہوا۔

بابری مسجد کا اس طرح ظالمانہ طور پر ڈھایا جانا ہندو انتہا پسندی کے آخری انجام کا

نا ہے۔ بابری مسجد کا انہدام دراصل ہندو انتہا پسندی کا انہدام ہے۔ اب انشاء اللہ اس
ں میں نیا احساس جاگے گا اور کم از کم دو نسل تک اس طرح کے کسی منفی واقعہ کو پھر
رانا ممکن نہ ہوگا۔

بابری مسجد کے انہدام نے تخریب پسند طاقتوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اب یقینی ہے کہ اس
ں میں سنجیدہ ذہن کے لوگوں کا غلبہ ہوگا۔ زندگی کی تعمیر کے مواقع کھل جائیں گے جو انتہا پسندوں
منفی کارروائیوں کی وجہ سے بند ہو گئے تھے۔ ۱۹۹۲ کا خاتمہ اس ملک میں مذہبی تشدد پسندی
خاتمہ ہے، اور اسی کے ساتھ امن اور رواداری اور باہمی احترام کے نئے دور کا آغاز بھی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ کے بعد ہندو صاحبان کی طرف سے جو ردعمل سامنے آیا ہے وہ بہت
صلہ افزا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت نے کھل کر مسجد کو ڈھانے کی مذمت کی ہے۔ اس کے بارہ
ں اخبارات کی رپورٹیں، ان کے اداریتی نوٹ اور ان میں چھپنے والے خطوط بتاتے ہیں کہ ہندو
ان کو اس واقعہ سے بہت سخت جھٹکا لگا ہے۔ اخباروں میں عام طور پر اس قسم کے الفاظ
دسمبر کے بارہ میں دیکھنے میں آئے :

A dark day, a black day, a day of shame.

ہر حالات تقریباً یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ہندو انتہا پسندی کی سخت حوصلہ شکنی ہوگی اور ایک عرصہ
، کے لیے وہ خود ہندوؤں کے درمیان بے زمین ہو کر رہ جائے گی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے لیے اب بہترین روش یہ ہے کہ وہ ماضی کی طرف
یکھیں، وہ صرف مستقبل کی طرف دیکھیں۔ ۶ دسمبر کے بعد پیش آنے والی صورتِ حال کو وہ
نے لیے تعمیر و استحکام کے وقفہ کے طور پر استعمال کریں۔

داخلی تعمیر کے پہلو سے اس ملک میں مسلمانوں کے لیے کرنے کے بہت کام ہیں ——
نوں کو اپنے اندر دینی اور اخلاقی بیداری لانا ہے۔ انھیں اسلام کا پیغام دوسروں تک
نے کے لیے محنت کرنا ہے۔ مسلم نسلوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنانا ہے۔ انھیں تجارت
منعت میں آگے بڑھنا ہے۔ انھیں اپنے موجودہ ملی اور اسلامی اداروں کو ترقی کی طرف لے
ہے۔ انھیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے۔ وغیرہ۔

نیا ہندستان

اکتوبر ۱۹۹۲ میں دو ہفتے کے لیے میں انگلینڈ میں تھا۔ وہاں لندن، برمنگھم، مانچسٹر وغیرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان مقامات پر بہت سے ہندستانیوں سے ملاقات ہوئی جو آزادی کے بعد ہندستان چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے اور وہاں آباد ہو گئے۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا آپ نے کس لیے ہندستان چھوڑ دیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ وطن ہم کو بھی عزیز ہے۔ مگر اپنے ملک ہمیں اس لیے چھوڑنا پڑا کہ وہاں کا سسٹم اچھا نہیں۔ وہاں ترقی کے مواقع نہیں۔

یہ بہت زیادہ سوچنے کی بات ہے۔ کیوں کہ آزادی کے لیے قربانیاں تو اس لیے دی تھیں کہ آزادی کے بعد ملک میں زیادہ اچھا نظام بنایا جا سکے گا۔ مگر عملی نتیجہ بالکل برعکس صورت میں ظاہر ہوا۔ آزادی کے بعد یہاں کا نظام پہلے سے زیادہ خراب ہو گیا۔

روزنامہ امرت بازار پتریکا کے سابق ایڈیٹر مسٹر موتی لال گھوش کا انتقال ۱۹۲۰ میں ہوا۔ اس وقت وہ کلکتہ کے اسپتال میں تھے، مہاتما گاندھی اسپتال میں ان سے ملے۔ جواہر لال نہرو کی روایت کے مطابق، موتی لال گھوش نے گاندھی جی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ باپو، میں مر رہا ہوں۔ مگر مجھے اطمینان ہے کہ اب میں ایک ایسی دنیا میں جا رہا ہوں جہاں برطانی راج نہ ہوگا:

... where the British Empire did not exist. (p. 66)

یہ ایک علامتی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی سے ہم نے کیا امیدیں قائم کی تھیں اور آزادی کے بعد کس طرح ہماری امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ ہماری پچھلی نسل ملک کے تمام مسائل کا ذمہ دار انگریز کو سمجھتی تھی۔ مگر جب آزادی آئی تو اس نے ہمارے کسی بھی مسئلہ کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ مسائل کو اور زیادہ بڑھا دیا۔

اس کی آخری حد یہ ہے کہ ہماری پچھلی نسل انگریزوں کے ہندستان میں زندہ رہنے کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتی تھی۔ مگر جب انگریز ہندستان کو چھوڑ کر اپنے ملک میں چلے گئے تو ہماری اگلی نسل کے لوگوں کا حال یہ ہوا کہ وہ ہندستان کو چھوڑ کر دوبارہ انگریزوں کے

ں جا جاکر آباد ہو گئے۔ حتی کہ یہ کہنے میں فخر محسوس کرنے لگے کہ وہ اور ان کے بچے اب
ڈ کے (برطانیہ) میں شل ہو گئے ہیں۔

آزادی سے پہلے ہمارے لیڈر تمام ملکی مسائل کا ذمہ دار انگریز کو ٹھہراتے تھے مگر جب
زادی آئی اور ملکی راج قائم ہوا تو مسائل ختم نہیں ہوئے۔ بلکہ برعکس طور پر مسائل میں پہلے
سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔

یہاں میں اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کروں گا۔ میری پیدائش ۱۹۲۵ میں ایک ایسے
اندان میں ہوئی جہاں آزادی کا چرچا تھا۔ ماحول میں بھی ہر طرف آزادی کی باتیں گونج رہی
تھیں۔ اس کے اثر سے میرے اندر یہ ذہن بنا کہ غلامی سب سے زیادہ بری چیز ہے،
ور آزادی سب سے زیادہ اچھی چیز ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میرے
ہن میں بھی آزادی کی تحریک کا یہ معصومانہ تصور قائم ہوا کہ آزادی کی تحریک گویا ملک کو جہنم
سے نکال کر جنت میں داخل کرنے کی تحریک ہے۔

ان احساسات کے ساتھ میں آزادی کے دن کا منتظر تھا۔ یہاں تک کہ انتظار پورا ہوا
ور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی تاریخ آ گئی۔ اس وقت میری عمر ۲۲ سال تھی، اور میں یوپی کے
ہر اعظم گڑھ میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رات کو میں گھر سے باہر نکلا۔ ہر طرف گھروں اور دکانوں
کے اوپر خوشیوں کے چراغ جل رہے تھے۔ میں اس احساس کے ساتھ سڑک پر چل رہا تھا کہ
ج میں آزاد ہوں۔ میرا حال یہ تھا کہ خوشی سے زمین پر پاؤں نہیں پڑ رہے تھے۔ "خوشی سے
مین پر پاؤں نہ پڑنا" میں نے ادب کی کتابوں میں پڑھا تھا، مگر اس کا عملی تجربہ پہلی بار
ا اگست ۱۹۴۷ کو ہوا۔ یہی آخری بھی تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد پھر کبھی مجھے اس قسم کی خوشی
تجربہ نہ ہو سکا۔

یہ ۱۵ اگست کی شب کی بات تھی۔ مگر جب صبح ہوئی تو تمام چراغ بجھ چکے تھے، اور پھر
، کبھی نہیں جلائے گئے۔ آزادی کا انتظار ہم سب کے لیے بہت خوش کن تھا، مگر آزادی
انا ہمارے لیے خوشی کا باعث نہ بن سکا۔ آزادی کا خواب، تعبیر ظاہر ہونے کے بعد بھی،
ے بے تعبیر خواب بنا ہوا ہے۔

اصل سبب

اس المیہ کا سبب انگریز نہیں ہیں بلکہ خود ہندستانی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پ
اس ملک میں جو مسئلہ تھا وہ انگریزوں اور ہندستانیوں کے درمیان تھا۔ اس وقت ا
مسئلہ کے حل کی صورت یہ تھی کہ ہندستانیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ک
جائے۔ فارمولا یہ تھا کہ ہندستانی جتنا زیادہ انگریز سے متنفر ہوں گے اتنا ہی زیاد
انگریزوں کی جڑ اس ملک سے اکھڑے گی اور وہ اس ملک میں حکومت کرنے کے مواق
کھو دیں گے۔

نفرت کی اس فضا کو پیدا کرنے کے لیے ہر قسم کے ذریعے اختیار کیے گئے۔ حتیٰ
انگریزوں کے اچھے کام کو بھی بری صورت میں پیش کیا گیا۔ مثلاً انگریزوں نے بٹوارہ سے
پہلے ہندستان میں ۲۵ ہزار میل لمبی ریلوے لائن بچھائی۔ اس ریلوے نظام نے پہلی با
ملک میں اِس سرے سے اُس سرے تک کے سفر کو آسان بنا دیا۔ مگر جواہر لال نہرو نے اس
مثبت کام میں بھی منفی پہلو تلاش کر لیا۔ انھوں نے کہا: ریلوے کی لوہے کی پٹریاں دراص
لوہے کی زنجیریں ہیں جو انگریزوں نے اس لیے بچھائی ہیں تاکہ ہندستانیوں کو پور
طرح غلامی میں جکڑ دیں۔

اس طرح نفرتوں کے ماحول میں آزادی کا سفر طے ہوا۔ اس زمانہ میں انگریزوں کے خلا
نفرت سے بھری ہوئی تقریر کرنے پر آدمی کو لیڈری ملتی تھی۔ انگریز کے اوپر گولی چلانے
آدمی ہیرو بن جاتا تھا۔ اس وقت انگریز دشمنی ملک دوستی کے ہم معنی بنی ہوئی تھی۔

۱۹۴۷ سے پہلے کا دور گویا تخریب کا دور تھا۔ اس زمانہ میں نفرت اور مخالف
کی سیاست بہت کار آمد ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ کے بعد تعمیر کا دور آگیا۔ اب محبت
سیاست کی اہمیت پیدا ہو گئی۔ مگر مخصوص اسباب کی بنا پر نئے دور میں بھی نفرت کی سیا
جاری رہی۔ وہ محبت کی سیاست میں تبدیل نہ ہو سکی۔ یہی سب سے بڑا سبب ہے جس
بنا پر آزادی کے بعد وہ ہندستان نہ بن سکا جس کا خواب آزادی سے پہلے دیکھا گیا تھا۔ اور
کے سہانے تصور میں ہر آدمی سرشار رہتا تھا۔

اکثریت واقلیت

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ وہ کمیونٹی جو نکسٹ ٹو میجاریٹی ہو وہ ہمیشہ مجاریٹی کی زد میں
[illegible]تی ہے۔ چھوٹی اقلیتیں آؤٹ آف فوکس ہو جاتی ہیں۔ اور پہلے اور دوسرے نمبر کی کمیونٹی
[illegible]یک دوسرے کے مقابلہ پر آجاتی ہے۔ آزاد ہندستان میں یہی ہوا۔ چنانچہ آزادی کے
[illegible]عد ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ہو گئے۔ پہلے اگر ملک میں ہندستانی
[illegible]ور انگریز کا مسئلہ تھا تو اب ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

مگر دونوں میں ایک فرق تھا۔ ہندستانی اور انگریز کے مسئلہ میں نفرت مطلوب تھی، جبکہ
[illegible]ندو اور مسلم مسئلہ میں محبت مطلوب ہو گئی۔ پہلے اگر باہمی نفرت سے مسئلہ حل ہوتا تھا تو اب
[illegible]ہمی محبت مسئلہ کا حل بن گیا۔ اس نازک موڑ پر ہمارے رہنما وہ کردار ادا نہ کر سکے جو ضروری
[illegible]ھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ کے بعد بھی ملک میں نفرت کا تسلسل جاری رہا، اور مسئلہ دن بدن نازک
[illegible]سے نازک تر ہوتا چلا گیا۔

اس معاملہ میں جاپان کی جدید تاریخ نہایت اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ دوسری عالمی
[illegible]نگ سے پہلے جاپانی قوم امریکی نفرت کی بنیاد پر اٹھی۔ اسی نفرت کے تحت جاپانیوں نے
[illegible]ریکہ کے بحری اڈہ پرل ہاربر پر دسمبر ۱۹۴۱ میں زبردست حملہ کیا اور اس کو تباہ کر دیا۔ اس
[illegible]ے بعد دونوں کے درمیان شدید جنگ جاری رہی۔ جو بالآخر ۱۹۴۵ میں جاپان کی شکست
[illegible]ر مغلوبیت پر ختم ہوئی۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ امریکی نفرت کا تسلسل جاپان میں جاری رہے۔ مگر جاپان کے
[illegible]برین نے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی قومی پالیسی کو نفرت کے بجائے محبت پر قائم
[illegible]یں۔ انھوں نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ امریکہ نے اگر ایٹم بم گرا کر ہمارے ہیروشیما کو برباد کیا تو
[illegible]بھی اس سے پہلے امریکہ کے پرل ہاربر کو برباد کر چکے تھے۔ اس لیے معاملہ برابر ہو گیا۔ آؤ،
[illegible]ب امریکہ سے دوستی کا تعلق قائم کر کے ہم اپنے ملک میں نئے تعمیری دور کا آغاز کریں۔

نفرت کے بجائے محبت کی اس پالیسی کو انھوں نے عملِ معکوس (reverse course)
[illegible]م دیا۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپان جن قوموں سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھا،

اب جاپان انھیں قوموں سے موافقت کر کے آگے بڑھنے لگا۔یہی وہ تبدیلی تھی جس کا نتیجہ آج دنیا کے سامنے اس شکل میں سامنے آیا ہے کہ جو جاپان دوسری عالمی جنگ سے شکست کھا کر نکلا تھا، اس کو آج یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ فاتح کے روپ میں دنیا کے سامنے نمایاں ہو سکے۔

آزادی کے بعد ہندستان میں بھی اسی قسم کے عمل معکوس کی ضرورت تھی۔اب ضرورت تھی کہ اس ملک میں نفرت کے بجائے محبت کی ہوائیں چلائی جائیں۔مگر ہمارے لیڈر بر وقت یہ کام نہ کر سکے۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں نفرت کا تسلسل جاری رہا۔ملک تعمیر کے رخ پر سفر نہ کر سکا۔ آزاد ہندستان جلد ہی برباد ہندستان کے ہم معنی بن گیا۔

جاپان نے اپنے بیرونی دشمن امریکہ سے نفرت کو چھوڑ کر محبت کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ہندستان میں یہی کام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہونا تھا۔یہاں بٹوارہ کی تحریک کے دوران دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف بن گئے تھے۔اب ضرورت تھی کہ دونوں کے اندر یہ ذہن پیدا کیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کے وطنی بھائی ہیں۔وہ ہر معاملہ میں ایک دوسرے کے شریک اور دوست ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے کچھ نادان مسلم لیڈروں نے غلط طور پر یہ ذہن بنایا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔اس نظریہ نے دونوں میں دوری پیدا کر دی۔مگر اس نظریہ کا تعلق نہ عقل سے تھا اور نہ اسلام سے۔کیونکہ قوم وطن سے بنتی ہے نہ کہ مذہب سے۔ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب بلاشبہ الگ ہے۔مگر دونوں ایک قوم ہیں، کیوں کہ دونوں ایک مشترک وطن میں رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تمام پیغمبروں نے اپنے غیر مذہب مخاطبین کو (اے میری قوم) کہہ کر خطاب کیا۔مگر ۱۹۴۷ کے بعد طاقت ور انداز میں اس فکر کی اشاعت نہ کی جا سکی۔

جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے ذمہ دار ہیں۔دونوں میں سے کسی نے بھی نئے ہندستان میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔قوموں کا ذہین طبقہ قوموں کو رہنمائی دیتا ہے۔مگر آزاد ہندستان

نوں ہی فرقے کے ذہین طبقے اس اعتبار سے ناکام ہو گئے۔

ہندوؤں میں ان کے مصنوعی دانشور (pseudo-intellectuals) اٹھے۔ انھوں
ے فرسٹ ڈیفیٹ اور سکنڈ ڈیفیٹ کا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو اکھنڈ بھارت بنانا
ہتے تھے، اور مسلمان تقسیم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر اس معاملہ میں ہندوؤں کو شکست تسلیم
نی پڑی۔ یہ ان کے لیے پہلی ہار (فرسٹ ڈیفیٹ) تھی۔ اب ہندو اکثریت میں ہیں اور
ب حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ہمیں کسی قیمت پر دوسری ہار (سکنڈ ڈیفیٹ) کو تسلیم نہیں
نا چاہیے۔

یہ بات مختلف الفاظ میں اتنے زور کے ساتھ کہی گئی کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر بیشتر
دؤوں کے ذہن پر چھا گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی
اع پیش آئے تو ہندو فوراً اس کو سکنڈ ڈیفیٹ کا مسئلہ سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً ہندو جلوس
سلم محلہ سے گزرے اور مسلمان کسی وجہ سے روٹ بدلنے کے لیے کہیں تو ہندو اس
البہ کو نہیں مانیں گے۔ کیوں کہ مذکورہ نفسیات کی بنا پر اس میں انھیں سکنڈ ڈیفیٹ نظر
نے لگتی ہے۔ اس نفسیات کی بنا پر ہندوؤں کی طاقت کا بڑا حصہ صرف منفی کارروائیوں میں
ہوا ہے، وہ ملک کی مثبت تعمیر میں استعمال نہ ہو سکا۔ سکنڈ ڈیفیٹ سے بچنے کی
شش میں وہ مکمل ڈیفیٹ سے دوچار ہو رہے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (۱۹۶۲-۱۹۰۱) نے ایک بار کہا تھا کہ انڈیا کو میں سیکولر ملک
وقت مانوں گا جب کہ سڑک پر ایک مسلمان ایک ہندو کو تھپڑ مارے اور شہر میں فرقہ وارانہ
نہ ہو۔ ہر بار جب کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو اسی طرح کے کسی معمولی واقعہ کی بنا پر
ہے۔ ایسا ہر واقعہ اصلاً صرف دو فرد کا واقعہ ہے، اور دو فرد کے مسئلہ کی حیثیت سے
وحل کرنا چاہیے۔ مگر جب بھی ایسا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو فوراً وہ دو فرقوں کے وقار
سئلہ بن جاتا ہے جو بڑھ کر خونیں فساد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ تمام تر اسی مذکورہ نفسیات
ہ ہے۔

ہندو اگر بٹوارہ کو فرسٹ ڈیفیٹ کے طور پر نہ لیتے بلکہ گزرے ہوئے دور کا ایک

واقعہ سمجھ کر اس کو ماضی کی تاریخ کے خانہ میں ڈال دیتے تو ۱۹۴۷ سے اسی طرح ملک کی تاریخ بننا شروع ہو جاتی جس طرح عین اسی زمانہ میں جاپان میں نئی تاریخ بننا شروع ہوئی تھی فرسٹ ڈیفیٹ اور سکنڈ ڈیفیٹ کے فلسفہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امکان واقعہ کی صورت اختیار نہ

اقلیت کے مسئلہ کے حل کے لیے ہندو رہنماؤں نے جو تدبیر سوچی وہ بظاہر اگرچہ مختلف الفاظ میں تھی، مگر سب کی تدبیر عملاً وہی تھی جس کو ان کا ایک حلقہ ہندتو یا انڈیانائزیشن تعبیر کرتا ہے۔ اس تدبیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان سے کلچر کے اختلاف کو ختم کر کے پو ملک کا ایک کلچر بنا دیا جائے۔ اس کو وہ فرقہ وارانہ یک جہتی یا ملکی اتحاد کا ذریعہ سمجھتے ہیں کا خیال ہے کہ اس طرح اقلیت کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

یہ تجویز بظاہر کتنی ہی خوب صورت ہو، وہ یقینی طور پر ناقابل عمل ہے۔ سب سے پہلے شہنشاہ اکبر نے اس کو ملک میں رائج کرنا چاہا مگر غیر معمولی سیاسی طاقت کے باوجود وہ ناکام رہا۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے ۲۰ سال محنت کر کے اپنی کتاب (Essential Unity of All Religions) تیار کی۔ مگر اپنے مقصد میں وہ کسی درجہ میں کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ مہاتما گاندھی بھی "رام رحیم ایک ہے" کے عنوان سے اس کے مبلغ تھے مگر انھیں بھی اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

امریکہ (U.S.A) میں بھی مختلف کلچر کے لوگ آباد ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے امریکہ میں وہ تحریک چلی جس کو عام طور پر امریکنا ئزیشن کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد امریکہ میں کلچر کو فروغ دینا تھا۔ مگر یہ تحریک امریکہ میں مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔ اور اب وہاں یونی کلچر کے بجائے ملٹی کلچرلزم کے اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ یعنی ایک کلچر نہیں بلکہ کئی کلچر۔

نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس معاملہ میں ہمارے لیے انتخاب (choice) یونی کلچر اور ملٹی کلچر میں نہیں ہے، بلکہ ملٹی کلچر اور تباہی میں ہے۔ اگر ہم یونی کلچر کے طریقہ پر اصرار کریں تو جو چیز عملاً حاصل ہوگی وہ یونی کلچر نہ ہوگا بلکہ برباد کلچر ہوگا۔ اس لیے بہترین عمل یہ ہے کہ ہم رواداری (ٹالرنس) کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے ملٹی کلچر کے طریقہ پر راضی ہو جائیں نہ کہ یونی کلچر کے طریقہ پر اصرار کر کے ملک کو تباہ کر دیں۔

اب مسلمانوں کے معاملہ کو لیجئے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں نے ملک کے بٹوارہ کی تحریک چلائی۔ ۔ۇوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر ہندؤوں کے بارہ میں ک پیدا ہو گئے۔ جو تقسیم کے بعد بھی ختم نہ ہو سکے۔ مزید یہ کہ تقسیم کے ساتھ ہی مسلمانوں ں بھی مصنوعی دانش ور (pseudo-intellectuals) اٹھے۔ انھوں نے مختلف انداز میں مانوں کے اندر اس قسم کے خیالات پھیلائے کہ ہندو منقسم ہندستان میں "دوسرا اسپین" ا چاہتا ہے۔ یہ فکر ایک یا دوسرے لفظ میں اتنا زیادہ عام ہوا کہ وہ مسلمانوں کی نفسیات ءتنہ بن گیا۔

اب یہ صورت حال ہے کہ جب بھی ہندو کی طرف سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے۔ مثلاً وہ مسلم علاقہ میں جلوس نکالتا ہے۔ یا کچھ نادان ہندو اٹھ کر مسلم مخالف نعرہ لگا دیتے ں تو فوراً مسلمانوں کے اندر یہ احساس جاگ اٹھتا ہے کہ ہندو یہاں سکنڈ اسپین بنانا چاہتے ں۔ اس دفاعی نفسیات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فوراً ہندو کے ساتھ مقابلہ آرائی کے لیے ے ہو جاتے ہیں۔ اب دو طرفہ ردعمل شروع ہوتا ہے جو فضا کو اس حد تک بگاڑ تا ہے کہ فساد کی نوبت آجاتی ہے۔

ایک "سکنڈ" کا اندیشہ ہندؤوں کو منفی نفسیات میں مبتلا کیے ہوئے ہے اور سرے "سکنڈ" کے اندیشہ نے مسلمانوں کو منفی نفسیات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہی اس ے میں ہندو مسلم مسئلہ کا خلاصہ ہے۔ اس طرح دونوں ہی فرقے اس سے محروم ہو گئے ہیں ہ ملک کی تعمیر میں مطلوبہ مثبت کردار ادا کر سکیں۔

اس طرح کے پیچیدہ مسائل کا حل کبھی دو طرفہ بنیاد پر نہیں نکلتا۔ اور یہی یہاں بھی ا۔ اس کا حل جب بھی نکلے گا یک طرفہ بنیاد پر نکلے گا۔ اس مسئلہ کا حل بائی لیٹرلزم میں نہیں ، بلکہ یونی لیٹرلزم میں ہے۔ ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے کسی ایک فرقہ کو اقدام کرنا ہوگا۔ ہم یہ انتظار کریں کہ پچاس فی صد اور پچاس فی صد کی بنیاد پر دونوں فرقے ذمہ داری قبول ں اور اس طرح دو طرفہ بنیاد پر مسئلہ کو حل کریں تو ایسا انتظار کبھی واقعہ بننے والا نہیں۔ ں واقعات اور انسانی نفسیات دونوں ایسے کسی امکان کا یکسر انکار کرتے ہیں۔

ان حالات میں میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اس معاملہ میں پہل کریں اور یک طرفہ
کے ذریعہ تمام باہمی جھگڑوں کو ختم کردیں۔ وہ نہ ہندو جلوس کی روٹ بدلنے کا مطالبہ کریں۔
مخالف نعروں پر مشتعل ہوں۔ نہ سروسوں میں کم لیے جانے کی شکایت کریں۔ نہ اُردو اور پرسنل
اور مسلم یونی ورسٹی جیسے مسائل پر مطالباتی تحریکیں اٹھائیں۔ غرض ہر معاملہ میں شکایت اور احتجاج
اور ردعمل کا طریقہ چھوڑ دیں۔ وہ خارجی احتجاج کی بنیاد پر تحریکیں چلانے کے بجائے داخلی
کی بنیاد پر اپنی تمام تحریکیں چلائیں۔

مسلمان اگر اس یک طرفہ اصول پر عمل کریں تو یہ ان کے لیے نہ صرف عملِ معکوس
(reverse course) کے مجرب طریقہ کو اختیار کرنے کے ہم معنی ہوگا، بلکہ یہ ان کے
عین ثواب کی بات بھی ہوگی۔ کیوں کہ یک طرفہ صبر پیغمبر اسلامؐ کی سنتوں میں سب سے بڑی
سنت ہے۔

مکہ سے ہجرت یک طرفہ صبر کی کارروائی تھی۔ حدیبیہ سے عمرہ کیے بغیر واپسی بھی اسی یک طرفہ
صبر کے اصول پر عمل کرنا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ یک طرفہ اقدام کے ذریعہ
نزاعی مسائل کو حل کیا۔ آج اگر مسلمان اس اصول پر عمل کریں تو یہ سنتِ رسول کی پیروی ہوگی اور
اس بنا پر عظیم ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ بے حد اہم بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد
مسلمان اس ملک میں نہایت اہم تخلیقی کردار (creative role) ادا کرنے کی حیثیت
سے تھے۔ ان کے حق میں تمام ضروری حالات جمع ہو چکے تھے۔ مگر مسلمان صبر کا ثبوت نہ دے
اس لیے یہ تخلیقی کردار ادا کرنا بھی ان کے لیے مقدر نہ ہو سکا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ان کو ہم نے امام بنایا کہ وہ لوگوں کو امرِ حق کی ہدایت
کرتے تھے، یہ اس وقت ہوا جب کہ انھوں نے صبر کیا (وجعلنا منهم أئمة
يهدون بأمرنا لما صبروا) اس دنیا میں قیادت و امامت کی واحد قیمت صبر
ہے، مسلمانوں نے صبر کی قیمت ادا نہیں کی، اس لیے وہ نئے ہندستان میں امام اور قائد کا
منصب بھی حاصل نہ کر سکے۔

ہندستان اور مسلمان

اولاً ہندستان میں وہ مسلمان آئے جو عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اعلیٰ اوصاف
ں بناپر ہندستان میں ان کا استقبال کیا گیا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں
ھا ہے کہ یہ عرب جب ہندستان آئے تو اپنے ساتھ شاندار کلچر (brilliant culture) لے کر
یاں آئے (ڈسکوری آف انڈیا، اڈیشن ۱۹۹۱، صفحہ ۲۲۷)

بعد کے دور میں ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ حکمراں اگرچہ قدیم عربوں
یسی اعلیٰ صفات کے حامل نہ تھے۔ تاہم ان سے بھی ہندستان کو امن اور انصاف کا تحفہ ملا۔
سلامی انقلاب کا سیلاب اتنا طاقت ور تھا کہ سیکڑوں سال بعد بھی اس کے اثرات مسلم نسلوں کے
ہن پر باقی تھے۔

مثلاً مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ حکومت میں اس کی ملکہ نور جہاں نے ایک راہ گیر کو طپنچہ
رکر ہلاک کر دیا۔ مقدمہ جہانگیر کے دربار میں پیش ہوا تو شبلی نعمانی کے الفاظ میں :

مفتی شرع نے بے خوف وخطر صاف کہا شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

ہانگیر اور اس کی ملکہ کو یہ ہمت نہ ہوسکی کہ وہ مفتی کے اس فتوے کا انکار کر دیں۔ دوسری
رف عین اسی زمانہ میں انگلینڈ میں جیمز فرسٹ کی حکومت تھی جو جہانگیر کا ہم عصر تھا۔ جسٹس کوک
نے ایک مالی مقدمہ میں ایک تاجر کے حق میں فیصلہ دیا۔ یہ فیصلہ جیمز فرسٹ کو اپنے خلاف معلوم ہوا۔
ں پر وہ جسٹس کوک سے خفا ہو گیا اور جسٹس کی حیثیت سے ان کا عہدہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد وہ دور آیا جب کہ ہندستان میں انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ انھوں نے
ں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اب ملک میں آزادی کی تحریک اٹھی۔ اس تحریک میں مسلمانوں نے
ا کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے لیے جان و مال کی قربانی کی ضرورت تھی۔ اس میں اپنے آپ کو
رنا تھا۔ اس میں مسلمانوں نے عملی حصہ لیا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کے یہاں جہاد کا تصور تھا۔ جب کہ
ہ و بھائیوں کے یہاں اس قسم کا کوئی سرفروشی کا تصور موجود نہ تھا۔ مسلمانوں نے آزادی کی
یک میں جہاد کا تصور شامل کر کے اس کو نہایت جاندار بنا دیا۔

وطنی آزادی کی تحریک کے لیے جہاد آزادی، مجاہد آزادی، شہید آزادی جیسے ولولہ انگیز

الفاظ مسلمانوں ہی نے دیے۔ اور بلاشبہ یہ تحریک آزادی میں مسلمانوں کا ایک تخلیقی عطیہ ہے
جس کے بغیر تحریک آزادی مکمل نہ ہوتی۔

۱۹۴۷ کے بعد وہ دور آیا جب کہ ملک آزاد ہو گیا۔ مگر اس نئے دور میں ہندستانی مسلمانوں کو بروقت صحیح رہ نمائی نہ مل سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حالات کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے وہ اس ملک میں دینے والے گروہ (giver group) کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد اس ملک میں وہ لینے والے گروہ (taker group) کی حیثیت اختیار کر گئے۔ یہی جدید ہندستان میں مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہر دور میں مسلمانوں کو عزت و احترام کا درجہ حاصل تھا۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد آنے والے دور میں انھیں عزت و احترام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ کوئی سازش یا تعصب نہیں ہے۔ اس کی وجہ خود مسلمانوں کی یہ داخلی کمزوری ہے کہ انھوں نے جدید دور میں پہنچ کر تخلیقیت (creativity) کھو دی۔ وہ اہل ملک کے لیے دوبارہ نفع بخش ثابت ہو سکے۔ جب کہ قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اس دنیا میں اسی کو ثبات اور استحکام حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے نفع بخشی کا ثبوت دے (الرعد ۱۷)

نئے ہندستان میں مسلمانوں کے لیے اس نفع بخشی کا موقع مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان مواقع کو سمجھا جائے، اور ضروری تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے انھیں استعمال کیا جائے۔ یہاں اس معاملہ کی وضاحت کے لیے میں دو مثالیں دوں گا۔

آزادی سے پہلے اس ملک کے مفکرین یہ سوچتے رہتے تھے کہ جب آزادی آئے گی تو اس کا نقشہ کیا ہوگا۔ اور آزاد ہندستان کی تعمیر کس طرح کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں غالباً پہلا قابل ذکر نام سوامی ویویکانند کا ہے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ میں ایک خط کے جواب میں لکھا کہ ہماری مادر وطن کے لیے دو عظیم نظاموں، ہندوازم اور اسلام کا ملاپ واحد امید ہے۔ میں اپنے دماغ کی آنکھ سے دیکھتا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان انتشار اور خرابی سے باعظمت اور ناقابل تسخیر بن کر اٹھ رہا ہے، اور یہ ویدانت برین اور اسلام باڈی کے ذریعہ ہو رہا ہے:

For our own motherland a junction of the two great systems, Hinduism and Islam, is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this choas and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body. (p. 380)

دوسری مثال مہاتما گاندھی کی ہے۔ ۱۹۳۶ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مختلف صوبوں میں …نگرس کی وزارتیں بنیں۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن (۲۷ جولائی …۱۹۱) میں کانگرسی وزیروں کو سادہ زندگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے …ھا کہ اس سلسلہ میں عملی نمونہ کے لیے میں رام اور کرشن کا نام نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ وہ تاریخی …خصیتیں (historic personalities) نہ تھیں۔ میں مجبور ہوں کہ دور اول کے اسلامی …فار کا حوالہ دوں۔ کیوں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے مگر انھوں نے …زدوں جیسی زندگی گزاری، انھوں نے کہا کہ ہم کو ابوبکر اور عمر کے نمونہ کی پیروی کرنا چاہیے :

We have to follow the example of Abu Bakr and Umar.

سوامی ویویکانند اور مہاتما گاندھی کے مذکورہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ آزاد ہندستان میں …لمانوں کے لیے ایک عظیم کردار ادا کرنے کا موقع تھا۔ حتی کہ خود ملک اس بات کا منتظر تھا کہ …لمان آگے بڑھیں اور یہ کردار ادا کرکے ملک میں اپنے لیے باعزت جگہ حاصل کریں۔ مگر مسلمان …ے کی ان امیدوں کو پورا نہ کرسکے۔ اور ساتھ ہی ملک کے مستقبل کی تعمیر بھی واقعہ نہ بن سکی۔

آزادی کے بعد ملک کی نئی تعمیر کے لیے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک اقدار (values) …ر دوسرے ان اقدار کے حق میں عملی نمونہ۔ مثلاً ایک قدر یہ ہے کہ حکمراں افراد کو بھی عام لوگوں …طرح معمولی زندگی گزارنا چاہیے تاکہ انھیں عام انسان کی ضرورتوں کا احساس رہے۔ ایک قدر …ہے کہ ایک بڑے آدمی کو بھی اسی طرح قانون کا ماتحت ہونا چاہیے جس طرح ایک چھوٹا آدمی۔ …ے قدر یہ ہے کہ ہر انسان کو سماج میں برابر کا درجہ ملنا چاہیے، خواہ وہ ایک نسل سے تعلق رکھتا …یا دوسری نسل سے۔ ایک قدر یہ ہے کہ عہدہ اور منصب لیاقت کی بنیاد پر ملنا چاہیے نہ کہ ذاتی …ف کی بنیاد پر۔ وغیرہ، وغیرہ۔

سوامی ویویکانند اور مہاتما گاندھی اور دوسرے ہندستانی مفکرین کا خیال تھا کہ ان

اقدار کا تصور تو ہمارے پاس موجود ہے۔ مگر ان اقدار کے حق میں عملی اور تاریخی نمونہ ہمارے
یہاں موجود نہیں۔ یہ عملی نمونہ تمام مذاہب میں صرف اسلام میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے ملک کی
نئی تشکیل کے لیے اسلام سے مدد لینا ضروری ہے۔

یہ نہایت صحیح اور مثبت سوچ تھی۔ مگر اس سوچ کو واقعہ بنانے کے لیے مسلمانوں کو
اس ملک میں ایک کردار ادا کرنا تھا۔ مسلمان بدقسمتی سے یہ کردار ادا نہ کر سکے۔ اس لیے یہ سوچ
بھی واقعہ بننے سے رہ گئی۔ آزادی کے بعد ہمارا ملک بھٹک کر دوسرے راستہ پر چل پڑا۔

نام نہاد مسلم دانشور اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس میں قصور مسلمانوں کا نہیں ہے بلکہ
ہندوؤں کا ہے۔ تقسیم کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کو مسلسل تعصب اور زیادتی کا سامنا پیش
آیا۔ اس بنا پر مسلمان تحفظ اور دفاع کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے۔ اور جو لوگ تحفظ اور دفاع کی
نفسیات میں مبتلا ہو جائیں وہ کوئی تخلیقی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

مگر یہ جواب درست نہیں۔ مسلمانوں کو جس بات کی شکایت ہے، وہ تو دراصل وہ قیمت
تھی جو مسلمانوں کو اس ملک میں ادا کرنا تھا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو امام
ہدایت بناتا ہے جو صبر کا ثبوت دیں (وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا)
اس سے معلوم ہوا کہ صبر ہی قیادت و امامت کی لازمی قیمت ہے۔ کسی ملک یا قوم کی
قیادت و امامت کی ذمہ داری ادا کرنے کی ناگزیر شرط یہ ہے کہ دوسروں کی طرف سے پیش
آنے والی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ اس صبر و برداشت کے بغیر کسی کو
امامت عالم کا مقام نہیں ملتا۔ یہ اللہ کا ایک محکم قانون ہے، اس میں کسی کا بھی کوئی استثنا نہیں۔

۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کو جو کام کرنا تھا وہ یہ تھا کہ برادران وطن کی طرف
سے اگر کوئی اشتعال انگیز بات کی جائے تو اس کو نظر انداز کریں۔ سروسوں میں اگر تعصب برتا جائے
تو برداشت کر لیں۔ حتیٰ کہ عملی زیادتی کے واقعات پیش آئیں تب بھی اس پر صبر کر لیں۔ ہر حال میں
وہ یک طرفہ اعراض کی پالیسی اختیار کریں۔

یہ مسلمانوں کے لیے وقفۂ عمل حاصل کرنے کی تدبیر تھی، اس طرح وہ اپنے ذہن کو منفی
رخ پر جانے سے روکتے۔ وہ ایسی فرصت پا لیتے جب کہ وہ مثبت طور پر لوگوں کے سامنے

سلام کی ان تعلیمات کو اور اس تاریخ کو لاسکیں جس میں ملک کی رہ نمائی ہے۔ اور جس کو اختیار
کے ملک میں صالح معاشرہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ حتیٰ کہ خود ملک ایک صدی سے جس کا انتظار
رہا ہے۔ مسلمان صبر نہ کر سکے اس لیے وہ اس قسم کا قیادتی رول ادا کرنے میں ناکام رہے۔

کرنے کا کام

اسلام فطرتِ انسانی کا مذہب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو مختلف قوموں میں پھیلنے
کے لیے کسی پھیلانے والے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنے زور پر پھیلتا ہے، جس طرح پانی خود اپنے
زور پر پیاسے تک پہنچتا ہے، ٹھیک اسی طرح اسلام خود اپنے زور پر لوگوں کے دلوں میں
داخل ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں۔ لمبی تاریخ نے اس کو ایک ثابت شدہ صداقت بنا دیا
ہے۔ اسلام آج ایک معلوم اور مسلّم مذہب ہے نہ کہ کوئی غیر معروف یا نزاعی مذہب۔ یہ ایسی
خصوصیت ہے جس نے اسلام کو یہ طاقت دے دی ہے کہ کوئی اس کو پھیلانے والا نہ ہو تب
بھی وہ پھیلتا ہے، کوئی اس کا اعلان کرنے والا نہ ہو تب بھی وہ لوگوں کے کانوں میں گونجتا ہے۔

اسلام کی اس خصوصیت کا تقاضا تھا کہ اسلام اس ملک کے لوگوں کے قلب و دماغ
میں اتر چکا ہوتا۔ ماضی میں بتدریج ایسا ہو بھی رہا تھا۔ مگر حالیہ تاریخ میں دو واقعات نے
اس فطری عمل پر روک لگا دیا۔ ایک ہے، دو قومی نظریہ، اور دوسرا ہے مسلمانوں کی
احتجاجی سیاست۔

تقسیم سے پہلے کچھ مسلم لیڈروں نے دو قومی نظریہ ایجاد کیا۔ اس نظریہ کے غیر اسلامی
ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس کو علماء نے پیش نہیں کیا۔ تاہم بعض اسباب کے نتیجہ
میں وہ عوام میں پھیل گیا۔ حتیٰ کہ اس نے ایک پرشور تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ یہ دو قومی
نظریہ اسلام کی عمومی اشاعت کے لیے قاتل تھا۔ کیوں کہ جب یہ ماحول بنا دیا جائے کہ اہلِ اسلام
مستقل طور پر الگ قوم ہیں اور غیر اہلِ اسلام مستقل طور پر الگ قوم، تو غیر مسلم قوموں میں اسلام
کو اپنانے کا احساس ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسلام لوگوں کے نزدیک
عقیدۂ غیر بن جاتا ہے نہ کہ عقیدۂ خویش۔

۱۹۴۷ میں دو قومی سیاست کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر مسلمانوں کے کچھ نادان لیڈر
کی سطحی سیاست کے نتیجہ میں وہ باقی رہی۔ مزید یہ کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے حالات نے مسلمانوں کے
اندر شدت سے منفی ذہن پیدا کیا۔ وہ اہل وطن کے مقابلہ میں احتجاجی سیاست کا جھنڈا لے
کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں دوبارہ ماحول میں تلخی کے اسباب پیدا ہو گئے۔ اسل
سنجیدہ غور و فکر کا موضوع نہ بن سکا۔

اب مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ دو قومی نظریہ سے اپنے ذہن کو
آزاد کر لیں اور ہر اس سرگرمی سے مکمل طور پر اجتناب کریں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے
درمیان تناؤ پیدا کرنے والی ہو، وہ یک طرفہ اہتمام کے ذریعہ دونوں فرقوں کے
درمیان معتدل فضا پیدا کریں۔

۱۔ اس جائزہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیاد
ہندو مسلم ملاپ کی صورتیں پیدا کریں۔ وہ ہر اس سرگرمی سے آخری حد تک پرہیز کریں جو ہندو مسل
تعلقات کو بگاڑنے والی ہو۔ وہ فریق ثانی کی طرف سے پیش آنے والی ہر زیادتی کو یک طرف
طور پر برداشت کریں۔

یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ دونوں فرقوں کے درمیان وہ معتدل فضا پیدا ہو جس میں
لوگ اسلام کا مطالعہ کریں۔ جس میں اسلام کے پیغام کو لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ اور و
اس پر سنجیدہ ذہن کے ساتھ غور کر سکیں۔

اگر مسلمان ایسا کریں کہ وہ فرقہ وارانہ اختلاف کے معاملہ میں یک طرفہ اعراض کی پالیسی
اختیار کر لیں اور ہر اس قول یا فعل سے مکمل پرہیز کریں جو فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے والا ہو تو
اس کے بعد اپنے آپ یہ ہوگا کہ جس طرح ملک کی صنعتی تعمیر کے لیے مغربی سائنس یہاں مطالعہ کا
موضوع بنی ہوئی ہے اسی طرح اسلام بھی یہاں سماجی تعمیر کے لیے مطالعہ اور غور و فکر کا موضوع
بن جائے گا، اور پھر اپنے آپ ملک میں ایک نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی۔

۲۔ مذکورہ عمل اس ملک میں اسلام کی اشاعت کے لیے شرط اول کی حیثیت رکھتا ہے۔
اسی کے ساتھ کچھ اور مددگار اعمال کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً مسلمان ملک کی زبان کو سیکھیں اور

ـبان میں اظہار خیال کی قدرت پیدا کریں۔ مسلمانوں نے چالیس سال تک اس ملک میں
فظ اردو" تحریک چلائی ہے۔ اس کے بجائے انھیں مسلمانوں میں یہ تحریک چلانی چاہیے تھی
لمان ہر زبان کو سیکھیں۔ ہر علاقہ کے لوگ اُس علاقہ کی زبان میں مہارت حاصل کریں۔ اردو
ظ کی تحریک موجودہ حالات میں سمٹاؤ کی علامت ہے، اور تمام ملکی زبانوں کو سیکھنے کی تحریک
لاؤ کی علامت۔

۳۔ اس کے بعد جو ضروری کام کرنا تھا وہ یہ تھا کہ ملک کی ہر زبان میں قرآن کا ترجمہ معمولی
ت پر فراہم کیا جائے۔ اس کے علاوہ حدیث اور سیرت کی بنیادی کتابوں کے ترجمے ہر
ن میں تیار کر کے شائع کیے جائیں۔ یہ کام اتنے بڑے پیمانہ پر کیا جائے کہ ہر شخص جو اسلام
علیمات اور اس کی تاریخ کو جاننا چاہے اس کو خود اپنی مادری زبان) میں کافی لٹریچر
سانی حاصل ہو جائے۔

۴۔ اسلامی تاریخ کے ان پہلوؤں پر کتابیں تیار کر کے پھیلائی جائیں جو موجودہ حالات
ے خاص طور پر مناسبت رکھتی ہیں مثلاً مساوات، انصاف، احترام انسانیت وغیرہ۔

خلیفہ اول ابوبکر صدیق نے پوری عمر نہایت سادہ زندگی گزاری۔ حتیٰ کہ مدینہ کے ایک
آدمی کی زندگی میں اور آپ کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا۔ مصر کے گورنر عمرو بن العاص کے
کے نے ایک عام آدمی کو کوڑا مارا۔ خلیفہ عمر فاروق کو اس کی شکایت پہنچی تو انھوں نے
نر کے صاحبزادے کو بلایا اور مذکورہ مصری کے ہاتھ میں کوڑا دیا کہ ان کو مار کر اپنی زیادتی
لہ لو۔ خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب اور ایک یہودی تاجر کے درمیان دمشق میں ایک
ہ پیش آیا تو خلیفہ کو ایک عام شہری کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ حضرت عمر بن
العزیز کی حکومت سندھ سے لے کر فرانس کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی مگر ان کے لیے کسی
ی سیکورٹی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مکہ فتح ہوا تو کعبہ کے اوپر کھڑے ہو کر اذان دینے کا کام
کو سپرد ہوا جو ایک حبشی غلام تھے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اسلام کی تاریخ میں تمام اعلیٰ معاشرتی قدروں کی معیاری مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً
ف، سادگی، تواضع، مساوات، اور امانت دارانہ معاملہ، وغیرہ۔ یہ چیزیں جن پر بہتر سماجی

نظام قائم ہوتا ہے ، ان تمام قدروں کی عملی مثالیں حقیقی واقعات کی صورت میں اسلام کی تا
میں محفوظ ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان کو خالص تاریخی اسلوب اور حقیقت نگاری کے انداز
مرتب کرکے اہل ملک کے سامنے لایا جائے اور اس سے لوگوں کو باخبر کیا جائے۔ مگر یہ
نہ ہو سکا۔ اگر کسی نے کوئی کتاب لکھی بھی ہے تو وہ قومی فخر کے انداز میں ہے نہ کہ بے لاگ
واقعہ نگاری کے انداز میں۔

موجودہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ نئے دور میں منفی ذہن لے کر داخل ہو
وہ مثبت ذہن کے تحت نئے دور میں داخل نہ ہو سکے۔ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے م
کا آغاز بھی ہے اور یہی اس کا اختتام بھی۔ اسی سے نئے دور میں ان کی تاریخ بگڑی ہے او
یہیں سے ازسرنو ان کی تاریخ بننا شروع ہوگی۔

ہندستان کے مسلم قائدین ۱۹۴۷ سے پہلے ۱۴ پوائنٹ پر مشتمل مطالبے پیش کرتے ر
اور ۱۹۴۷ کے بعد وہ ۲۰۰ پوائنٹ پر مشتمل اپنے مطالبے پیش کر رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر، وہ ا
ملک میں مسلسل مانگنے والے بنے ہوئے ہیں۔ اور تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ کوئی شخص یا قوم بیک
وقت دینے والا اور مانگنے والا نہیں بن سکتا۔ مسلمان چونکہ مانگنے والے بنے ہوئے ہیں، اس
لیے وہ اس ملک میں دینے والے بھی نہ بن سکے۔

نوٹ : ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ کو ناگپور میں ایک کنونشن ہوا۔ اس کا موضوع "قومی اتحاد، ایک
اور سیکولرزم" تھا۔ یہ مقالہ اس تقریر پر مبنی ہے جو اس موقع پر وسنت راؤ دیش پانڈے
ہال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مجمع میں کی گئی۔

مذہبی ہم آہنگی اور اسلام

پُرامن دنیا کی تعمیر بلاشبہ آج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور اس مسئلہ کا بہت گہرا تعلق اس چیز سے ہے جس کو مذہبی ہم آہنگی (religious harmony) کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کا کوئی قابلِ عمل فارمولا دریافت کیا جائے۔ مذہبی امن ہی پر، بڑی حد تک، عالمی امن کا انحصار ہے۔

اسلام سماجی امن کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر یک طرفہ صبر کے ذریعہ امن قائم ہو سکتا ہو تو یک طرفہ صبر و برداشت کی قیمت دے کر امن کا ماحول قائم کیا جائے۔ اس کی ایک واضح مثال اسلامی تاریخ کے دورِ اول کا وہ واقعہ ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ حقیقۃً دس سال کا امن معاہدہ تھا۔ اور پیغمبر اسلام نے امن کا یہ معاہدہ جنگ جو دشمن کی تمام مانگوں کو یک طرفہ طور پر منظور کر کے حاصل کیا تھا۔

مذہبی ہم آہنگی کا ماحول قائم کرنا اسلام کا عین مطلوب ہے۔ تاہم اصل مقصد سے پورا اتفاق رکھتے ہوئے اس معاملہ میں اسلام کی تدبیر مجوزہ تدبیروں سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس معاملہ میں اسلام کی تدبیر کا خلاصہ، ایک لفظ میں یہ ہے کہ —— مذاہب کے درمیان ھم آہنگی نہیں، بلکہ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی۔ اگلی سطروں میں اس کی کسی قدر وضاحت کی جائے گی۔

مذہبی ہم آہنگی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جتنے نظریے پیش کیے گئے ہیں یا پیش کیے جا سکتے ہیں، وہ بنیادی طور پر غالباً تین قسم کے ہیں۔ ان میں سے دو وہ ہیں جو مذہب کی نئی تشریح پر مبنی ہیں۔ بعض اسکالر قسم کے ذہنوں نے بطور خود مذہب کی کچھ تشریحات کی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی یہ تشریحات عمومی طور پر قبول کر لی جائیں تو اس کے بعد اپنے آپ سماج میں مذہبی ھم آہنگی کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ تیسری تدبیر وہ ہے جو مذہب کی کسی مخصوص تشریح پر مبنی نہیں۔ اس کی حیثیت صرف ایک عملی تدبیر کی ہے۔

بڑی تقسیم کے مطابق، مذہبی ہم آہنگی کے یہی تین نظریات ہیں۔ ان کو الگ الگ سمجھنے کے لیے انھیں حسب ذیل تین نام دیے جا سکتے ہیں —— سیکولر حل،

وحدتِ ادیان ، مذہبی رواداری۔

اسلام کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ دین فطرت ہے۔ چنانچہ اسلام ہر مسئلہ کے فطری حل کو پسند کرتا ہے۔ مذکورہ تینوں تدبیروں میں ابتدائی دو تدبیریں حقیقۃً مصنوعی تدبیریں ہیں۔ جب کہ تیسری تدبیر فطری تدبیر ہے۔ یہی تیسری تدبیر اسلام کے مزاج کے مطابق ہے اور اسلام اس کی حمایت کرتا ہے۔

۱۔ مذہبی ہم آہنگی لانے کی مذکورہ تجویزوں میں پہلی تجویز مذہب کی سیکولر تعبیر پر قائم ہے۔ اس کے مطابق، مذہب لوگوں کا نجی یا شخصی عقیدہ ہے۔ اجتماعی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نظریہ کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس اصول کو ماننے کے بعد مذہبی جھگڑے باقی نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد مذہب اگر باقی رہے گا تو محدود طور پر صرف افراد کی پرائیویٹ زندگی میں باقی رہے گا۔ اس کے باہر اس کا کوئی وجود نہ ہوگا۔ اور جب باہر کی زندگی میں مذہب کا وجود نہ ہوگا تو وہ اجتماعی زندگی کے لیے کوئی مسئلہ بھی نہ بن سکے گا۔

یہ حل یقینی طور پر ناقابل عمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مذہب کی ایک نئی تشریح کے اوپر قائم ہے۔ اس تشریح کو نہ اب تک اہل مذاہب نے مانا ہے اور نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے کہ وہ اس کو مان لیں۔ پھر جس تشریح کو اہل مذاہب ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، اس کو عملی طور پر کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ اس کو ماننے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اسلام کے نزدیک دین کا تعلق انسان کے سارے معاملات سے ہے نہ کہ محض ذاتی عقائد سے۔

مزید یہ کہ یہ طرزِ فکر سراسر غیر فطری ہے۔ یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ ایک نقطۂ نظر کو سچا سمجھے، اس کے باوجود وہ نقطۂ نظر صرف اس کے پرائیویٹ دائرہ میں محدود رہے۔ جس طرح رنگ پانی کے گلاس میں ڈالنے کے بعد ضرور پھیلتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ جب ایک تصور کو بطور صداقت مان لیں تو یہ اعتراف کسی مخفی دائرہ میں محدود ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ ضرور پھیلے گا۔ وہ نجی زندگی سے نکل کر اجتماعی زندگی تک پہنچنا چاہے گا۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر یہ ممکن نہیں کہ مذہب کی سیکولر تشریح کے تحت وہ سماج

ماحول قائم کیا جا سکے جس کو مذہبی ہم آہنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ مذہبی ہم آہنگی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسرا نظریہ جو پیش کیا جاتا ہے وہ وحدتِ ادیان کا نظریہ ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین یہ کہتے ہیں کہ تمام مذاہب، ظاہری فرق کے باوجود، حقیقتہً ایک ہیں۔ تمام مذاہب ایک ہی مشترک منزل کی طرف جانے کے متعدد راستے ہیں۔ اس لیے باہمی ہم آہنگی کے مقصد کو حاصل کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کو اس مذہبی یکسانیت کا یقین دلا دیا جائے۔ جب یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے گی تو اس کے بعد تمام اختلافات اپنے آپ مٹ جائیں گے۔

مگر یہ نقطۂ نظر محض ایک دعویٰ ہے جس کے پیچھے کوئی دلیل نہیں۔ علمی اور تاریخی مطالعہ بتاتا ہے کہ مذاہب کا باہمی فرق محض ظاہری نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔ مثال کے طور پر خدا کا عقیدہ، جو ایک بنیادی مذہبی عقیدہ ہے، اس کے سلسلہ میں بعض مذاہب توحید الٰہ (monotheism) کے قائل ہیں اور بعض دوسرے مذاہب وحدت وجود (monism) کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اس نقطۂ نظر سے موافقت نہیں کرتا۔ مزید یہ کہ، تجربہ کے مطابق، یہ حل عملی طور پر قابل نفاذ بھی نہیں۔

تجربہ بتاتا ہے کہ "تمام مذاہب ایک ہیں" کی بنیاد پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش بار بار کی گئی ہے اور بار بار ناکام ثابت ہوئی ہے۔ شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) نے "دینِ الٰہی" کے نام پر اس کو طاقت کے ذریعہ نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے اسی کام کو علمی طور پر کیا۔ اور اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر کے ایک ہزار صفحہ پر مشتمل ایک کتاب (Essential Unity of All Religions) تیار کی۔ مہاتما گاندھی (۱۹۴۸-۱۸۶۹) نے "رام رحیم ایک ہے" کے نعرہ پر اس کو ملک گیر تحریک کے ذریعہ پھیلانا چاہا۔ مگر ہر ایک اپنے مقصد میں مکمل طور پر ناکام رہا۔

پھر جس تجویز کے ساتھ نہ فطری صداقت ہو اور نہ وہ قابل عمل ہو تو ایسی تجویز کو مذکورہ مسئلہ کا حل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تجویز ایک اچھا تخیل ہو سکتا ہے مگر وہ زیر بحث مسئلہ کا ایک اچھا حل نہیں۔

۳- اب مذہبی ہم آہنگی کے مقصد کو حاصل کرنے کی تیسری تجویز باقی رہتی ہے۔ اور وہ رواداری ہے۔ یہی قابل عمل ہے اور اسلام اسی کی حمایت کرتا ہے۔

یہ تیسرا حل دراصل حقیقت پسندی کے اصول پر مبنی ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں پریکٹیکل اپروچ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ مذاہب میں فکری فرق کو مانتے ہوئے عملی برتاؤ میں باہمی احترام کیا جائے۔ اعتقادی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ یہ تقریباً وہی اصول ہے جس کو انگریزی مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ آؤ ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے :

Let's agree to disagree

اس اصول کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ —— مذاہب کے درمیان ہم آہنگی نہیں، بلکہ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی۔ مختلف مذہبوں میں نظریاتی وحدت نہیں، بلکہ مختلف مذہبی گروہوں میں عملی وحدت :

This principle is best described not as religious harmony,
but as harmony among religious people.

یہ کوئی تخیلاتی بات نہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کی افادیت تاریخ کے تجربہ سے ثابت ہے۔ اور وہ پوری طرح قابل عمل ہے۔ ماضی میں یا حال میں جب کبھی بھی لوگوں کے درمیان وہ چیز بالفعل قائم ہوئی ہے جس کو "مذہبی ہم آہنگی" کہا جاتا ہے، وہ ہمیشہ اختلاف کے باوجود اتحاد کی بنا پر قائم ہوئی ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر اتحاد کی بنا پر۔

اس کی ایک مثال ہمیں کناڈا میں ملتی ہے۔ کناڈا میں تقریباً ہر مذہب کے لوگ آباد ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہاں وحدتِ کلچر (یونی کلچرلزم) کی تحریک چلائی گئی۔ مگر وہ پوری طرح ناکام ہوگئی۔ اس تجربہ کے بعد کناڈا کے ذمہ داروں نے وحدتِ کلچر کے نظریہ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ اب وہاں تعددِ کلچر (ملٹی کلچرلزم) کو رواج دیا جارہا ہے اور وہ پوری طرح کامیاب ہے۔ حتیٰ کہ کناڈا پوری مغربی دنیا میں مذہب اور کلچر کی ہم آہنگی کا ایک قابل حوالہ نمونہ بن گیا ہے۔

یہی معاملہ امریکہ کا بھی ہے۔ امریکہ میں مختلف مذہب اور کلچر کے لوگ آباد ہیں۔ دوسری

عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ تمام لوگوں کو ایک ہی "امریکن کلچر" پر ڈھال دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے حکومت کے تحت ایک زبردست مہم چلائی گئی جس کو امریکی بنانا (Americanisation) کہا گیا۔ مگر یہ کوشش مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔

اب امریکہ نے امریکنائزیشن کا تصور چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بجائے وہ ہر کلچر کو آزادی دینے کا حامی ہے۔ پہلے اگر وہاں یونی کلچرلزم کا نظریہ تھا تو اب وہاں ملٹی کلچرلزم کا نظریہ اختیار کر لیا گیا ہے۔

امریکہ کے ۴۲ ویں صدر بل کلنٹن (Bill Clinton) جو نومبر ۱۹۹۲ میں امریکہ کے نئے صدر منتخب ہوئے ہیں، انھوں نے کامیابی کے بعد اپنی پہلی ہی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک وہ تھی جس کو ٹائمس آف انڈیا (۵ نومبر ۱۹۹۲) کے کرسپانڈنٹ مقیم واشنگٹن نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ منتخب امریکی صدر نے نئی حب الوطنی کی اپیل کی جو امریکی عوام کو باہم جوڑ دے تاکہ ہمارا فرق و اختلاف ہمارے لیے طاقت کا ذریعہ بن جائے:

The president-elect invoked a new patriotism to bring the American people together so that our diversity can be a source of strength.

یہاں پہنچ کر ہمیں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ "اختلاف کے باوجود اتحاد" کے اصول کو مستقل طور پر کس طرح برقرار رکھا جائے۔ اس کی سادہ فطری تدبیر یہ ہے کہ مشترک مفاد کی خاطر ہر گروہ اس اصول کو مان لے کہ: پر امن دائرہ میں ہر ایک کو آزادی، مگر جارحیت کے دائرہ میں کسی کو آزادی نہیں۔ ہر ایک اپنے عقیدہ کے مطابق، قول و عمل کے لیے آزاد ہو۔ مگر ہر ایک کی آزادی وہاں ختم ہو جائے جہاں اس کی آزادی دوسرے کو عملی نقصان پہنچانے کا باعث بن رہی ہو۔

اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر یہی ہے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی مثال اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی طرح ہے جو کھونٹے کے ساتھ رسی میں بندھا ہوا ہو۔ وہ گھومتا ہے اور پھر اپنے کھونٹے کی طرف واپس آجاتا ہے (مثلُ المؤمنِ و مثلُ الایمانِ کمثل الفرس فی آخِیّتِہِ یجول ثم یرجع إلی آخیّتہ) مشکاۃ المصابیح ۱۲۲۶/۲

وسیع تر انطباق کے اعتبار سے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کو دائرۂ امن

کی رسی سے بندھا رہنا ہے۔ جب بھی کسی کی سرگرمی جارحیت غیر تک پہنچ جائے تو گویا اس کی رسی کی حد آگئی۔ اس کے بعد آدمی پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دوبارہ امن کے دائرہ کی طرف واپس آجائے۔

یہ فطرت کا قانون ہے جس پر پوری کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ وسیع خلا میں بے شمار متحرک ستارے ہیں مگر وہ دوسرے ستاروں سے ٹکراؤ کیے بغیر اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ جنگل کے جانور ہر وقت سرگرم رہتے ہیں مگر حقیقی فطری ضرورت کے سوا کبھی کوئی جانور دوسرے جانور سے نہیں ٹکراتا۔ یہی طریقہ انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان کو اپنے قول و فعل کی آزادی ہے۔ مگر اس آزادی کا استعمال صرف امن کے دائرہ میں کرنا ہے، جارحیت کے دائرہ میں داخل ہونے سے مکمل طور پر ہر ایک کو باز رہنا ہے۔ جارحیت سے پرہیز کے اس اصول کو ایک لفظ میں اصول اعراض (principle of avoidance) کہا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن میں ایک اصولی حکم یہ ملتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں (لا اکراہ فی الدین) دوسری جگہ اعلان کیا گیا ہے کہ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین (لکم دینکم ولی دین) اسی حکم کی بنا پر ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ گئے تو وہاں آپ نے ایک صحیفہ (ڈیکلریشن) جاری کیا۔ اس میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی تحریر تھا کہ مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا دین ہوگا اور یہود کے لیے یہود کا دین (للمسلمین دینہم ولليهود دينہم) باہمی ہم آہنگی کی اس فضا کو باقی رکھنے کے لیے قرآن میں اہل اسلام کو یہ حکم دیا گیا کہ :

ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم كذلك زينا لكل امة عملهم ثم الى ربهم مرجعهم فينبئهم بما كانوا يعملون (الانعام ١٠٩)	اللہ کے سوا جن کو لوگ پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو ورنہ وہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر اس کارروائی سے بچو جو ایک مذہبی گروہ اور دوسرے مذہبی گروہ کے درمیان تلخی پیدا کرنے والی ہو۔ اختلاف کے باوجود اتحاد کی فضا کو برقرار رکھنے

کا پورا اہتمام کرو۔ خواہ کتنا ہی زیادہ فکری اختلاف ہو، مگر باہمی تعلقات کو ہر حال میں احترام کی بنیاد پر قائم کرو۔ فکری اور اعتقادی اختلاف کو عملی ٹکراؤ تک ہرگز نہ جانے دو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس اصول کی ایک انتہائی انقلابی مثال ملتی ہے۔ اور وہ قدیم مدینہ کا وہ تاریخی واقعہ ہے جو گویا تین مذاہب کا اجتماع تھا۔ تین مذاہب کا یہ اجتماع خود مسجد نبوی میں ہوا۔

محمد بن اسحاق کے واسطے سے ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ غزوۂ بدر سے کچھ پہلے نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد تحقیق حال کے لیے مدینہ آیا۔ اس میں ساٹھ افراد شامل تھے۔ یہ لوگ مدینہ کی مسجد میں ٹھہرے۔ ان کی آمد کے بعد مدینہ کے علماء یہود بھی وہاں آ گئے۔ اس طرح تین مذہبوں (اسلام، عیسائیت، یہودیت) کے ماننے والے مسجد کے اندر جمع ہو گئے۔ ان کے درمیان کئی دن تک مذہبی امور پر بحث جاری رہی۔ اس کی تفصیل سیرۃ ابن ہشام میں دیکھی جا سکتی ہے۔

روایت میں مزید بتایا گیا ہے کہ اس دوران عیسائیوں کی عبادت کا وقت آ گیا۔ وہ مسجد نبوی میں کھڑے ہو گئے اور اپنے طریقہ کے مطابق اپنی عبادت کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں انھیں کرنے دو۔ چنانچہ انھوں نے مشرق کی سمت میں اپنی عبادت ادا کی (وقد حانت صلاتهم فقاموا فى مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم يُصَلُّونَ۔ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : دَعُوهم۔ فصلّوا الى المشرق (سیرۃ ابن ہشام ۲/۲۰۶)

محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب حیاۃ محمدؐ میں بجا طور پر اس کو مؤتمر الادیان الثلاثۃ کا نام دیا ہے۔ یہاں ہم ان کی کتاب کے انگریزی ترجمہ (The Life of Muhammad) سے دو پیراگراف نقل کرتے ہیں :

> The three scriptural religions thus confronted one another in Madinah. The delegation entered with the Prophet into public debate and these were soon joined by the Jews, thus resulting in a tripartite dialogue between Judaism, Christianity and Islam. This was a truly great congress which the city of Yathrib had witnessed. In it, the three religions which today dominate the world and determine its destiny had met, and they did so for the greatest idea and the noblest purpose. (pp. 195-96)

اسلام اگرچہ اس کا قائل ہے کہ سچائی صرف ایک ہے، سچائی کئی نہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ علمی رواداری کا بھی اسی شدت کے ساتھ حکم دیتا ہے۔ اس کی آخری حد، مذکورہ سنت کے مطابق، یہ ہے کہ اسلام میں اس کی بھی اجازت ہے کہ غیر مسلم حضرات اسلامی عبادت خانہ (مسجد) میں آئیں۔ وہاں مختلف مذاہب کے درمیان مذاکرہ منعقد کیا جائے۔ حتی کہ اس دوران میں اگر ان کی عبادت کا وقت آ جائے تو وہ مسجد کے اندر اپنے طریقہ کے مطابق عبادت کرنے کے لیے بھی آزاد ہیں۔

یہ اصول خود پیغمبر کی سنت سے ثابت ہے۔ تاہم اب اس میں مکہ اور مدینہ کی مسجدیں شامل نہیں ہوں گی۔ کیوں کہ پیغمبر نے بعد کو خدا کے حکم سے مکہ اور مدینہ کو حرم قرار دے دیا۔ غیر مسلم حضرات دوسری تمام مسجدوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ البتہ حرمین (مکہ، مدینہ) میں ان کو داخل ہونے کی رخصت نہ ہوگی۔ یہ گویا کلیہ میں استثنار کا معاملہ ہے۔ اور کلیہ میں استثنا ہونا ایک معلوم ومعروف اصول ہے۔

علمی رواداری کا یہ اصول اسلام کی پوری تاریخ میں مسلسل طور پر رائج اور قائم رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں اسلام نے اپنے دور اول میں حیرت ناک کامیابی (astonishing success) حاصل کی اور اسپین سے لے کر انڈیا تک دنیا کا بڑا حصہ اسلام کے تحت آ گیا:

Within a century after the Prophet's death in AD 632, (the early generations of Muslims) had brought a large part of the globe - from Spain across Central Asia to India - under a new Arab Muslim empire. (9/912)

تاہم ان عظیم فتوحات کے باوجود، برٹانیکا کے مطابق، مسلم دنیا میں دوسرے مذہب کے لوگوں کو پوری طرح مذہبی آزادی (religious autonomy) حاصل تھی۔ اسلام نے توحید حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے دوسرے تمام مذاہب کا پورا احترام ملحوظ رکھا اور ان کے ساتھ کامل رواداری کا معاملہ کیا (۹/۹۱۲)

علمی نقطۂ نظر سے ایک بے حد اہم بات یہ ہے کہ آج ہم جن مذاہب کے درمیان ہم آہنگ لانا چاہتے ہیں، وہ مذاہب نئے نہیں ہیں بلکہ ہر مذہب قدیم مذہب ہے اور ہر مذہب قائم شدہ

مذہب (established religion) کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کوئی مذہب جب قدامت کے اس مرحلہ میں پہنچ جائے تو وہ اپنے ماننے والوں کے درمیان ہمیشہ مقدس حیثیت حاصل کر لیتا ہے، اس کے بعد اس میں کسی قسم کی تبدیلی لانا یکسر ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی مذہب میں تبدیلی کی کوشش ایک نیا مذہب پیدا کر کے اصل مسئلہ میں اضافہ تو کر سکتی ہے، مگر اس طرح کی کوئی کوشش خود اس مذہب کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کی متعدد مثالیں ماضی بعید اور ماضی قریب میں موجود ہیں۔

اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی مذکورہ تیسری تجویز ہی واحد تجویز ہے جو قابل عمل ہے۔ اس کے سوا کوئی اور تجویز، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی اچھی معلوم ہو، اس کو بالفعل وقوع میں لانا ممکن نہیں۔

ایک مذہبی اسکالر سے اس موضوع پر میری گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ پچھلے سو سال سے ہم مذاہب کے درمیان ہم آہنگی لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۸۹۳ میں اسی مقصد کے لیے شکاگو میں مذاہب کی عالمی پارلی منٹ (World Parliament of Religions) منعقد کی گئی۔ اس کے بعد سے اب تک اس نوعیت کی بے شمار کوششیں کی گئی ہیں۔ مگر اس معاملہ میں ہماری تمام کوششیں سراسر بے نتیجہ ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس راہ میں کچھ ناقابل عبور رکاوٹیں (insurmountable obstacles) حائل ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ بلاشبہ قابل حصول ہے۔ مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک ممکن مقصد کو ناممکن تدبیر کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مذہبی ہم آہنگی یقیناً ایک مطلوب چیز ہے۔ مگر اس کو اس طرح حاصل نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کے مروجہ عقیدہ کو بدل کر انھیں ایک اور عقیدہ پر لانے کی کوشش کی جائے جس کو ایک یا زیادہ اسکالر نے ریسرچ کر کے وضع کیا ہو۔ اس کی واحد قابل عمل تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے مروجہ عقیدہ کو چھیڑے بغیر انھیں اس پر راضی کیا جائے کہ وہ مشترک انسانی ضرورت کے تحت دوسرے مذہب کے لوگوں کا احترام کریں۔ وہ دوسرے مذہب والوں کے ساتھ رواداری (tolerance) کا سلوک کریں۔ وہ فکری اختلاف کے باوجود عملی ہم آہنگی کے طریقہ پر قائم رہیں۔

زندگی کے اصولوں میں سے ایک اصول وہ ہے جس کو عملیت (pragmatism) کہا جاتا ہے۔ یعنی جہاں نظریاتی تدبیر کام نہ کر رہی ہو وہاں پریکٹیکل تدبیر کا طریقہ اختیار کرنا۔ جہاں لوگ ایک دوسرے سے اعتقادی اتفاق نہ کر سکتے ہوں، وہاں زندگی کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے لوگوں کا اس پر راضی ہو جانا کہ ہر ایک اپنے عقیدہ پر باقی رہتے ہوئے یہ کوشش کرے کہ ایک دوسرے کے درمیان عملی ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

پریکٹیکل تدبیر —— ایک عام اور معروف اصول ہے۔ ہر شخص کو اپنی ذاتی زندگی میں اسے لازماً اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں کہیں نہ کہیں ایسا موقع آجاتا ہے جبکہ وہ نظریاتی معقولیت (theoretical reason) کو نظر انداز کر کے عملی معقولیت (practical reason) کی بنیاد پر لوگوں سے تعلق قائم کرتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ تدبیر کوئی نئی تدبیر نہیں۔ اس کو ماننا لوگوں کے لیے خود اپنے اختیار کردہ طریقہ کی ایک توسیع ہے، نہ کہ الگ سے کوئی نیا طریقہ اختیار کرنا۔

نوٹ: یہ مقالہ انٹر ریلیجس فیڈریشن فار ورلڈ پیس، نیویارک کے زیر انتظام نئی دہلی میں ہونے والی انٹرنیشنل کانفرنس بتاریخ ۱- ۷ فروری ۱۹۹۳ میں (انگریزی میں) پیش کرنے کے لیے لکھا گیا۔ کانفرنس کا موضوع یہ تھا:

Seeking Global Harmony Through Inter-Religious Action

Swami Vivekananda on Islam

The Hindus may get the credit of arriving at it earlier than other races, yet practical Advaitism, which looks upon and behaves to all mankind as one's own soul, was never developed among the Hindus.

On the other hand, my experience is that if ever any religion approached to this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone. I am firmly persuaded, therefore, that without the help of practical Islam, theories of Vedantism, however fine and wonderful they may be, are entirely valuless to the vast mass of mankind.

For our own motherland as junction of the two great systems, Hinduism and Islam, — Vedanta brain and Islam body — is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body (pp. 379-380).

Letters of Swami Vivekananda,
Advaita Ashrama
5, Dehi Entally Road,
Calcutta, 1970, p. 463

Indian Muslims at the Crossroads

By Shailendranath Gosh

As one who, early in his youth, was attracted to the Islamic message of social equality and universal sharing of resources and lived, as a peasant organiser, among the Muslim masses for many years in pre-partition Bengal's countryside sharing their ethos; and as one who, in 1947-48, witnessed the depths of their remorse over their earlier separatist craze, I direct this appeal to our Muslim brothers and sisters.

The true interests of the Muslims can be served much better by defining the goal in harmoniously constructive terms rather than in a spirit of separatist negativism. To be better Muslims and more prosperous would be a laudable goal.

My Muslim brethren need to know that I, a Hindu, am interested in the affairs of the Muslims for many reasons. I had hoped that the Indian Muslims, after their chastening experience of 1947, could turn to another road — to find a **separate identity** for themselves by being ahead of others in **creativity** and thus be the harbinger of a new Indian Renaissance. It has happened many times in history that a creative minority has sparked the rebirth of a whole nation.

The Hindustan Times, April 4, 1986

انسانیت انتظار میں ہے

مشہور ہندو عالم سوامی ویویکانند نے لکھا ہے کہ زندگی کے وحدانی تصور (ادویتا واد) پر دوسری نسلوں سے پہلے پہونچنے کا کریڈٹ ہندوؤں کو مل سکتا ہے، مگر عملی وحدانیت جو کہ تمام انسانیت کو ایک سمجھے اور سب سے ایک طرح کا سلوک کرے، کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہو سکی۔

دوسری طرف میرا تجربہ ہے کہ اگر کوئی مذہب کبھی اس مساوات تک قابل لحاظ طور پر پہونچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس بنا پر میں یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر، ویدانت کے نظریات، خواہ وہ کتنے ہی عمدہ اور حیرت انگیز ہوں، وسیع انسانیت کے لیے مکمل طور پر بے فائدہ ہیں۔

ہماری مادر وطن کے لیے جو کہ دو بڑے مذہبی نظاموں ہندو ازم اور اسلام کا سنگم ہے، ویدانت دماغ اور اسلام جسم واحد امید ہے۔ میں اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان بحران اور انتشار سے نکل کر شاندار اور ناقابل تسخیر بن رہا ہے اور یہ واقعہ ویدانت دماغ اور اسلام جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ (۱۸۹۸)

مسٹر شیلندر ناتھ گھوش نے لکھا ہے کہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں اسلام کے سماجی مساوات اور عالمی اشتراک کے پیغام سے متاثر ہوا، اور تقسیم سے پہلے بنگال میں مسلم عوام کے درمیان کسانی تنظیم کے تحت رہا اور ان کے عقائد و نظریات سے قریبی واقفیت حاصل کی، اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے ۴۸-۱۹۴۷ میں تقسیم کے بارہ میں ان کے سابقہ دیوانہ پن پر انھیں شرمندہ ہوتے ہوئے دیکھا، میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے نام یہ اپیل جاری کر رہا ہوں۔

مسلمانوں کے سچے مفادات اس طرح زیادہ بہتر طور پر حاصل کیے جا سکتے ہیں کہ ان کی منزل متحدہ تعمیری اصطلاحات میں مقرر کی جائے نہ کہ منفی انداز اور تفریق کی روح کے ساتھ اس کا تعین کیا جائے۔ اچھا مسلمان اور زیادہ خوش حال بننا بلاشبہ ان کا اعلیٰ مقصد قرار دیا جا سکتا ہے۔ میرے مسلمان بھائیوں کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ میں جو کہ ایک ہندو ہوں۔ مختلف

اسباب سے مسلمانوں کے معاملات میں دل چسپی رکھتا ہوں۔ میں نے امید کی تھی کہ ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ کے سبق آموز تجربہ کے بعد، ایک اور راستہ کی طرف مڑ سکیں گے، وہ اپنا علٰحدہ تشخص اس میں پائیں گے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ تخلیقی ثابت کریں اور اس طرح وہ ہندستان کی نشأۃ ثانیہ کے نقیب بنیں۔ تاریخ میں ایسا بہت بار ہوا ہے کہ ایک تخلیقی اقلیت ایک پوری قوم کو نئی زندگی کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔

تبصـــرہ

ہندستان کے ہندوؤں میں، میرے اندازہ کے مطابق، پچاس فیصد سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو مسلمانوں کے بارہ میں وہ مثبت اور خیر خواہانہ تصور رکھتے ہیں جس کا دو نمونہ اوپر کے اقتباس میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات، خاص طور پر توحید اور مساوات، سے متاثر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام کی ان قدروں کو ملک میں فروغ دیا جائے۔ کیوں کہ ان کے بغیر ملک کی حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ مسلمان اٹھیں اور اپنے اس تخلیقی کردار کو ادا کریں۔ مسلمان امکانی طور پر پوری طرح اس کی استعداد رکھتے ہیں۔ بلکہ وہی واحد گروہ ہیں جو اس قسم کا مثبت کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ وہی وہ لوگ ہیں جن کے پاس خدا کی آفاقی تعلیمات کا غیر محرف اڈیشن موجود ہے۔

مسلمان بلاشبہ اس تاریخی کردار کو ادا کر کے موجودہ ماحول میں اپنے لیے باعزت جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر اس کردار کو ادا کرنے کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو وقتی حالات سے اوپر اٹھائیں۔ وہ یک طرفہ طور پر ہر قسم کی شکایتوں اور ناانصافیوں کو نظر انداز کر دیں۔ وہ کھونے پر غم کرنا چھوڑ دیں اور محرومی کی تلخیوں کو بھلا دیں۔ جس دن وہ ایسا کریں گے اسی دن وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اس ملک میں وہ ایجابی رول ادا کر سکیں جس کا تاریخ کو صدیوں سے انتظار ہے۔

یہی وہ قربانی ہے جس کو قرآن میں صبر کہا گیا ہے، اور صبر کرنے والوں ہی کے لیے مقدر ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے مطابق قوموں اور ملکوں کے قائد بنیں (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا)۔

قومی اتحاد

بھارت وکاس پریشد (نئی دہلی) ۱۹۶۹ میں قائم ہوئی۔ یہ ایک تعلیمی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ اس کے موجودہ سرپرست ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی اور صدر جسٹس ایچ آر کھنہ ہیں۔ ۱۱-۱۲ فروری ۱۹۸۹ میں اس کی طرف سے ایک آل انڈیا سیمینار ہوا۔ سیمینار کی کارروائیاں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں انجام پائیں۔ ۱۲ فروری کی شام کو "کلوزنگ سیشن" میں میرا پیپر رکھا گیا تھا۔ اس کے تحت مذکورہ سیمینار میں شرکت ہوئی۔ اس سیمینار کا موضوع تھا ـــــ قومی اتحاد اور ہندستان کی مذہبی اقلیتیں:

National unity and religious minorities in India

۸۹-۱۹۸۸ کے درمیان مجھے اس قسم کے کئی سیمیناروں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا مختصر ذکر الرسالہ میں "خبرنامہ اسلامی مرکز" کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ تمام سیمینار راجدھانی دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ اور ان میں بڑے بڑے ہندو دماغ شریک تھے۔ لوگوں کی تقریریں سننے کے بعد میرا احساس یہ تھا کہ "ہندو دماغ" ملک کی موجودہ صورت حال پر سخت تشویش میں مبتلا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ملک میں فرقہ واریت کا مسئلہ ختم ہو۔ ملک میں قومی اتحاد آئے۔ تمام فرقے اور گروہ یک جہتی کے ساتھ مثبت عمل کی راہ پر لگ جائیں کیوں کہ اس کے بغیر ملک کی حقیقی ترقی ممکن نہیں۔

فکری سادگی

تاہم ان اجتماعات کو سننے اور دیکھنے کے بعد میرا مشترک احساس یہ تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا احساس تو ضرور لوگوں کے اندر شدید طور پر پیدا ہوا ہے، مگر فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہو، اس کے بارے میں ان کا ذہن ابھی تک واضح نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ سسٹم یا قانون میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ سیمینار میں یہ تجویز کیا گیا کہ ہندستان کے دستور میں جہاں اقلیتی حق (Minority right) کا لفظ لکھا ہوا ہے، وہاں اس کو بدل کر انسانی حق (Human right) کا لفظ لکھ دیا جائے۔ اقلیتی کمیشن کو ختم کر کے اس کی جگہ انسانی کمیشن مقرر کیا جائے، وغیرہ۔

اس قسم کی تجویزوں کے پیچھے یہ ذہن ہے کہ ملک میں جو گروہ بندی اور فرقہ وارانہ امتیاز ہے،

وہ اس لیے ہے کہ ہمارا دستور "اقلیتوں کے حقوق" کا لفظ بولتا ہے۔ وہ ملک میں کئی گروہ تسلیم کر کے ان کے الگ الگ حقوق مقرر کرتا ہے۔ اس سے علیحدگی کا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر دستور میں "انسانی حقوق" کا لفظ درج کر دیا جائے تو ملک کے تمام لوگ ایک ہی نوع (انسان) نظر آئیں گے۔ اس کے بعد اپنے آپ علیحدگی کا ماحول ختم ہو کر یگانگت کا ماحول قائم ہو جائے گا۔

مگر یہ اصل معاملہ کو بہت سادہ سمجھنا (Oversimplification) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ امر واقعہ کو بدلنے کا ہے نہ کہ کسی لفظ کو بدلنے کا۔ درخت کی دنیا میں اگر پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہیں تو آپ کانٹوں کے مسئلہ کو اس طرح ختم نہیں کر سکتے کہ اپنی درخت کی ڈکشنری سے کانٹے کا لفظ نکال دیں، اور ہر جگہ صرف پھول ہی پھول لکھ دیں۔ درخت میں کانٹے کا مسئلہ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ اور ایک حقیقی مسئلہ کو حقیقی سطح پر عمل کر کے حل کیا جا سکتا ہے نہ کہ لفظی سطح پر عمل کر کے۔

مذکورہ فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اقلیت" اور "اکثریت" کا لفظ امتیاز اور علیحدگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے سماج میں طبقات پیدا ہوتے ہیں، اس کے برعکس اگر دستور میں "انسان" کا لفظ لکھ دیا جائے تو امتیاز کا تصور ختم ہو جائے گا اور سماج میں طبقاتی علیحدگی ختم ہو کر طبقاتی یکسانیت کا دور آجائے گا۔

مگر اس قسم کی سوچ سادہ لوحی (Naive thinking) کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستانی سماج اور اسی طرح تمام ملکوں کے سماج میں مختلف نسلی اور مذہبی طبقات پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق موجود ہیں اور موجود رہیں گے۔ ان کو اس طرح ختم نہیں کیا جا سکتا کہ قانون میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا جائے۔

اس کی ایک عملی مثال ہریجن کا مسئلہ ہے۔ ہریجنوں کے سلسلہ میں وہ چیز عملاً حاصل کی جا چکی ہے جس کا مطالبہ اقلیتوں کے سلسلہ میں کیا جا رہا ہے۔ قدیم تصور کے مطابق، ہندو اونچی ذات کے لوگ ہیں اور ہریجن (شُدر) نیچی ذات کے لوگ۔ آزادی کے بعد جو قانون سازی ہوئی ہے، اس میں دونوں کو لفظی طور پر ایک کر دیا گیا ہے، چنانچہ ہمارا موجودہ دستور دونوں کو یکساں طور پر ہندو قرار دیتا ہے۔

مگر کیا اس لفظی یکسانیت کی وجہ سے ہندو (اونچی ذات) اور ہریجن (نیچی ذات) کا فرق ختم

ہوگیا۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ لفظی یکسانیت پیدا کرنے کے باوجود دونوں میں سماجی یکسانیت نہیں آئی، دونوں کے درمیان سابقہ تفریق بدستور پوری طرح باقی ہے۔

سبق آموز مثال

جو لوگ فرقہ وارانہ مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ شمالی ہندستان کو کل ہندستان سمجھ لیتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا تجزیہ بھی نادرست ہوتا ہے اور ان کا پیش کردہ حل بھی نادرست۔

زیر بحث مسئلہ کا ایک اہم ترین عملی پہلو یہ ہے کہ یہ ملک دو مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک شمالی ہند، اور دوسرے جنوبی ہند۔ پچھلی نصف صدی کی تاریخ بتاتی ہے کہ جتنے بھی فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے ہیں، وہ سب کے سب شمالی ہند میں ہوتے ہیں۔ جنوبی ہند میں اس قسم کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا جنوب کے علاقہ میں ہوا ہے، تو وہ شمالی ہند کے لوگوں ہی کا پیدا کردہ تھا جو کسی وجہ سے وہاں پہنچ گئے۔ خود جنوبی ہند کے لوگوں نے کبھی اس قسم کا کوئی جھگڑا برپا نہیں کیا۔ جب کہ وہ تمام فرقے جنوبی ہند میں بھی موجود ہیں جو شمالی ہند میں موجود ہیں۔ اور وہ تمام گروہی فرق وہاں بھی پائے جاتے ہیں، جو یہاں پائے جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شمالی ہند میں ہم جس مسئلہ کو حل کرنے کی باتیں کرتے ہیں، وہ جنوبی ہند میں عملاً حل شدہ ہے، جب ایسا ہے تو سب سے پہلے ہمیں ملک کے دونوں علاقوں کے فرق کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ موجودہ صورت حال میں ہمیں اس کے سوا اور کچھ نہیں کرنا ہے کہ جنوبی ہند کو شمالی ہند تک وسیع کردیں۔ جو کچھ ملک کے ایک حصہ میں جاری ہے، اس کو ملک کے دوسرے حصہ میں جاری کردیں۔

راقم الحروف نے جنوبی ہند کے کئی سفر کیے ہیں اور اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ اس فرق کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ جنوبی ہند کے لوگوں میں تحمل (Tolerance) ہے، جب کہ شمالی ہند کے لوگوں میں تحمل نہیں۔ جنوبی ہند کے لوگ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہیں کرتے۔ جب کہ شمالی ہند کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ اختلاف کا کوئی واقعہ سامنے آتے ہی وہ فوراً ٹکراؤ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کا مزاج تحمل ہے، اور شمالی ہند کا مزاج عدم تحمل۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں علاقوں کے درمیان

یہ فرق پیدا کر دیا ہے کہ شمالی ہند میں فرقہ وارانہ جھگڑے زندگی کا معمول بن گئے ہیں، جب کہ جنوبی ہند میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا سرے سے کوئی وجود نہیں۔

اوپر کی مثال ایک عملی واقعہ کی صورت میں بتاتی ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ اختلاف کے باوجود فرقہ وارانہ اتحاد کے ساتھ زندگی گزاریں۔ جو صورت حال آج بھی ملک کے ایک حصہ میں قائم ہے، وہی صورت حال ملک کے دوسرے حصہ میں قائم کر دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حقیقی اور پائدار حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کی سوچ کو درست کیا جائے۔ ہمارے ملک کا یا دوسرے لفظوں میں شمالی ہند کا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف اسباب سے یہاں کے لوگوں کی سوچ بگڑ گئی ہے۔ یہی جڑ کی بات ہے۔ اور اس جڑ پر عمل کر کے ہی فرقہ وارانہ مسئلہ اور دوسرے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

کسی سماج میں مختلف فرقوں کا ہونا بالکل فطری بات ہے، وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ہمارے موجودہ سماج کی اصل برائی خود فرقوں کی موجودگی نہیں، بلکہ مختلف فرقوں کے درمیان تحمل (Tolerance) کی غیر موجودگی ہے۔ فرقہ واریت کا مسئلہ عدم تحمل کا پیدا کردہ ہے، نہ کہ خود فرقوں کی موجودگی کا پیدا کردہ۔

برداشت کی ضرورت

سماج میں مختلف سطحوں پر فرق اور اختلاف کا ہونا بالکل لازمی ہے۔ آپ سماج کے اوپر یکسانیت کا بلڈوزر نہیں چلا سکتے۔ روسی ڈکٹیٹر اسٹالن نے اپنے ملک میں بے طبقاتی سماج (Classless society) قائم کرنے کے لیے ۲۵ ملین انسانوں کو پیس ڈالا۔ پھر بھی وہ بے طبقاتی سماج بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر آپ اس ناممکن کام کو کس طرح ممکن بنا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا قابل عمل حل صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر تحمل کا مزاج اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ انھیں اختلاف میں اتحاد (Unity in diversity) کا سبق دیا جائے۔ قومی اتحاد ہم کو اختلاف کے باوجود قائم کرنا ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر۔ کیوں کہ وہ ممکن ہی نہیں۔

قوم کے افراد کے اندر تحمل کا مطلوبہ مزاج پیدا کرنے کے لیے ہمیں وہی عمل کرنا ہے جس کو فیبین

سوسائٹی نے نفوذ کرنے (Permeation) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی شعور کو بدلنے کی مہم جاری کر کے لوگوں کے ذہنوں میں گھسنا اور ان کو اندر سے اس طرح بدل دینا کہ ان کے سوچنے کا ڈھنگ وہ ہو جائے جو کہ دراصل ہونا چاہیے۔

قومی اتحاد اور قومی یک جہتی کا لفظ تو اس ملک میں پچھلی نصف صدی سے بولا جا رہا ہے، مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی حقیقی کام مطلق نہیں کیا گیا۔ یہ یقینی ہے کہ کانفرنس کرنا، یا پلے کارڈ لے کر سڑکوں پر مارچ کرنا وہ کام نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہو۔ اس کام کے لیے شعور کی تربیت کی ایک طویل اور مسلسل مہم درکار ہے، مگر قومی اتحاد کا نعرہ لگانے والوں میں سے کوئی بھی اب تک اپنے آپ کو اس کام کے لیے فارغ نہ کر سکا۔

مثال کے طور پر صحافت اس ذہنی انقلاب کو لانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ آج ہمارے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اخبار یا رسالہ نہیں جو اس مقصد کے لیے وقف ہو۔ ہمارے تمام اخبار حقیقۃً سیاسی اخبار ہیں۔ اس کے بعد جو ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہنامے ہیں وہ سنسنی خیز مضامین چھاپ کر سستی تجارت کرنے کے سوا کچھ اور نہیں جانتے۔ شعور سازی کے اداروں کا جب یہ حال ہو تو وقتی اپیل جاری کرنے سے کیا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

راقم الحروف پچھلے ۳۰ سال سے اپنے آپ کو تعمیری صحافت کو وجود میں لانے کے لیے وقف کیے ہوئے ہے۔ ماہنامہ الرسالہ (اُردو اور انگریزی میں) ملک کا واحد ماہنامہ ہے جو تعمیر شعور کا کام کر رہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ کام اس سے زیادہ بڑا ہے کہ ایک یا دو ماہنامہ اس کو انجام دے سکے۔

رہنماؤں کی ذمہ داری

حقیقت یہ ہے کہ عوام کو بدلنے کے لیے سب سے پہلے عوام کے رہنماؤں کو بدلنا ہے۔ ہماری قوم کے جو لکھنے اور بولنے والے ہیں، جن کو سن کر اور پڑھ کر لوگ اپنی رائیں بناتے ہیں، ان کی ایک فی صد تعداد بھی اگر اس قربانی پر آمادہ ہو جائے جو پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان انگلینڈ کے فیبین لوگوں نے دی تھی۔ تو یقینی طور پر ہمارے ملک کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

یہ لوگ یہ طے کر لیں کہ وہ سستی شہرت اور سستی تجارت کے راستہ کو چھوڑ کر خاموش تعمیری کام میں

اپنے آپ کو وقف کریں گے۔ وہ قوم کے اندر مثبت ذہن اور تعمیری مزاج بنانے میں اپنے زبان و
قلم کی ساری طاقت خرچ کر دیں گے۔ اور اس کام کو مسلسل جاری رکھیں گے، یہاں تک کہ اسی پر
ان کی موت آجائے۔ اگر ہماری قوم کے ذہین طبقہ کا ایک فی صد حصہ بھی یہ عزم کرلے تو مجھے یقین ہے کہ
اس کا عزم ہمارے ملک کی تاریخ کو بدل سکتا ہے۔

پنڈت موتی لال نہرو سے کسی نے ایک بار پوچھا کہ جس آزادی کے لیے آپ کوشش کر رہے
ہیں، وہ آزادی کب آئے گی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں آزادی کا وقت تو نہیں جانتا، مگر میں یہ
جانتا ہوں کہ اگر میں نے اس راہ میں اپنی جان دے دی تو میری لاش پر آزادی کا محل تعمیر ہو کر رہے گا۔

میں کہوں گا کہ ہمارے ملک کا دانشور طبقہ اگر تربیتِ شعور (Consciousness raising)
کی مہم میں اپنے کو فنا کرنے کا عزم کرلے تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے لیے کچھ نہ پا سکے، مگر یہ یقینی ہے کہ اس
کی قربانی قوم کو نئی زندگی دینے کا سبب بن جائے گی۔

چھوٹا کام

تعمیر قوم کا کام تعمیر ذہن سے شروع ہوتا ہے، یہ ایک نہایت واضح بات ہے۔ یہ اتنی کھلی ہوئی
حقیقت ہے کہ اس کو سمجھنا کسی کے لیے مشکل نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ آج کوئی شخص نہیں
جو اس اہم ترین کام میں اپنے آپ کو مصروف کیے ہوئے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے کام جن میں لوگ مصروف ہیں، وہ کہنے اور سننے میں بڑے کام معلوم
ہوتے ہیں۔ وہ فوراً اخبار میں چھپتے ہیں۔ ان کے ذریعہ صبح و شام میں آدمی کو شہرت و مقبولیت حاصل
ہو جاتی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر تمام حوصلہ مند افراد جوق در جوق ان کاموں کی طرف دوڑے
چلے جا رہے ہیں۔ اور تعمیر شعور کا میدان بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔

تعمیر شعور کا کام بظاہر ایک چھوٹا کام معلوم ہوتا ہے۔ وہ اخباروں میں نمایاں نہیں ہوتا۔ اس کے نام پر
بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔ اس کی اپیل پر بڑے بڑے چندے نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کام کی اہمیت
کو جانتے ہوئے بھی اس کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

اگر قوم کے اندر چند ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہوں، اور اسی کے
ساتھ وہ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ چھوٹے کام کو بڑا کام سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو اس کے فوراً بعد

ملک و قوم کے مستقبل کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا، اور جب ایک صحیح کام شروع ہو جائے تو وہ لازماً اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ راستہ کی کوئی بھی چیز اس کو روکنے والی نہیں۔

احتساب غیر، احتساب خویش

آج ہمارے تمام اخبارات اور تمام جلسے، خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، سیاسی باتوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لوگوں کو سیاسی موضوعات کے سوا کسی اور موضوع پر کچھ کہنا آتا ہی نہیں۔

یہ صورت حال دراصل خود لکھنے اور بولنے والوں کی اپنی کمزوری پر مبنی ہے۔ سیاست کے موضوع پر کلام کرنا گویا دوسروں کے خلاف کلام کرنا ہے، اور تعمیر کے موضوع پر کلام کرنا خود اپنے خلاف کلام کرنا۔ سیاسی موضوعات میں خارجی پارٹیاں، خارجی شخصیتیں، خارجی واقعات زیر بحث آتے ہیں۔ اس کے برعکس تعمیری موضوعات میں داخلی مسائل اور اندرونی کمزوریاں زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ سیاسی موضوع پر بولنا دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے، تعمیری موضوع پر بولنا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہراتا۔ ایک لفظ میں، سیاست دوسروں کا احتساب ہے اور تعمیر خود اپنا احتساب۔ اور یہ معلوم بات ہے کہ دوسروں کا احتساب آدمی کے لیے سب سے زیادہ محبوب چیز ہے اور اپنا احتساب آدمی کے لیے سب سے زیادہ مبغوض چیز۔

لیکن اگر ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہے تو ہمارے لکھنے اور بولنے والوں کو لازماً یہ مبغوض کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا مستقبل کی تعمیر کی کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

حل کی طرف

ہندستان کے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک کتاب لندن سے شائع ہوئی ہے۔ اس کو مسٹر ایم جے اکبر نے مرتب کیا ہے اور وہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے :

M.J. Akbar, *Nehru: The Making of India*, 1988

اس کتاب میں نہرو کی زندگی سے متعلق کافی معلومات درج ہیں۔ اس کے باب ۴۷ میں مولف نے لکھا ہے کہ ۱۹۵۷ کے الکشن کے بعد جب کیرالا میں کمیونسٹ پارٹی نے وزارت بنائی تو نئی دہلی کی ایک مجلس میں اس کا ذکر آیا۔ ایک ہال میں حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ نہرو بحیثیت وزیر اعظم شریک تھے۔ گفتگو کے دوران مسٹر وائی ڈی گنڈیویا نے کہا کہ جناب، کیرالا میں کمیونسٹوں نے اپنی حکومت بنالی ہے۔ اگر وہ کل کے الکشن میں دوبارہ جیت جائیں اور دہلی کی حکومت پر قبضہ کرلیں تو اس کے بعد مرکز کا کیا حال ہوگا۔

نہرو نے جواب دینے سے پہلے تھوڑی دیر سوچا اور پھر بولے "کمیونسٹ، کمیونسٹ، کمیونسٹ، آخر آپ لوگ کمیونسٹوں سے اور کمیونزم سے اس قدر گھبراتے کیوں ہیں۔ آپ کیوں ایسا سوچتے ہیں کہ کمیونسٹ مرکز میں اقتدار حاصل کرلیں گے۔" اس کے بعد نہرو دوبارہ چپ ہوگیے۔ پھر رک کر اور اعتماد کے لہجہ میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ "ہندستان کے لیے خطرہ، اچھی طرح جان لیجیے، کمیونزم نہیں، یہ دائیں بازو کی ہندو فرقہ پرستی ہے :

**The danger to India, mark you, is not Communism.
It is Hindu right-wing communalism (p. 580).**

مسٹر گنڈیویا جنھوں نے اپنی کتاب **Outside the Archives** میں یہ واقعہ لکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ نہرو نے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اپنے مذکورہ جملہ کو کئی بار دہرایا۔

جواہر لال نہرو کو مہاتما گاندھی نے اپنا سیاسی جانشین **(Political successor)** کہا تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد وہ ہندستان کے وزیر اعظم بن گیے۔ تاہم جواہر لال اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک نرم آدمی تھے۔ دوسری طرف کیبنٹ میں ان کے رفیق سردار پٹیل ایک آہنی انسان کہے جاتے

تھے۔ سردار پٹیل مزاجاً سخت متعصب تھے، اسی کے ساتھ مرکزی حکومت میں امور داخلہ کا شعبہ ان کے پاس تھا۔

آزادی (۱۹۴۷) کے فوراً پہلے اور اس کے بعد ملک میں جو فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔ ان کو دبانے کی اصل ذمہ داری سردار پٹیل کی تھی۔ مگر انھوں نے اس معاملہ میں ڈھیل دینے کی پالیسی اختیار کی۔ جواہر لال نہرو کو اس مسئلہ پر سردار پٹیل سے سخت اختلاف تھا۔ بدرالدین طیب جی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اگر نہرو نے اس معاملہ میں اس وقت مضبوط موقف اختیار کیا ہوتا، وہ سردار پٹیل کی مخالفت کرتے جب کہ ابھی مہاتما گاندھی زندہ تھے تو ہندستان کی سیاست کا رخ بالکل دوسرا ہوتا:

If he had taken a stand then, opposing Sardar Patel while Gandhi was still alive, Indian politics would have taken quite a different turn.
Badruddin Tayabji, *Memoirs of An Egoist,* vol. I, p. 186.

میرے نزدیک یہ بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ نہرو ایک طرف آزاد ہندستان کے مسائل رکھتے تھے جن سے نمٹنے کے لیے انھیں ایک سخت ہاتھ کی ضرورت تھی۔ مثال کے طور پر ۵۰۰ دیسی ریاستوں کا مسئلہ، اس کو سردار پٹیل کے سخت ہاتھ نے جس طرح حل کیا، غالباً نہرو کے لیے اس طرح اس کا حل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ پٹیل کسی ایک شخص کا نام نہ تھا، وہ دراصل ہندو فرقہ پرستی کے پورے گروپ کی علامت تھا۔ یہ گروپ اتنا طاقتور تھا کہ اس نے اسی سوال پر خود گاندھی کو قتل کر دیا۔ پھر نہرو کے لیے کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اس پر قابو پا لیتے۔

کسی دوسرے کی کمزوری سے زیادہ یہ خود ہندو فرقہ پرستی کی طاقت تھی جس نے نہرو کو دبالیا اسی نے مہاتما گاندھی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ راج گوپال اچاری کو سیاست سے بے دخل کر دیا اور اکشے برہم چاری جیسے کتنے منصف مزاج ہندوؤں کو عاجز کرکے چھوڑ دیا۔ وغیرہ

نہرو نے جس خطرہ کی نشاندہی کی تھی، وہ آج ایک واقعہ بن چکا ہے۔ آج ہندو فرقہ پرستی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھی ہے اور اپنے بھیانک نتائج دکھا رہی ہے۔ آج بھی ہندوؤں میں ایسے ہوش مند اور انصاف پسند لوگ موجود ہیں جو اس کے خلاف آواز اٹھا رہے

ہیں۔ اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے برابر اس کی مثالیں آتی رہتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک مثال کا ذکر کرتے ہیں۔

مشہور ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ (۶ نومبر ۱۹۸۸) میں مسٹر اٹل بہاری باجپئی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جو ہر محب وطن کے لیے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کا عنوان اس پورے انٹرویو کا خلاصہ ہے :

پرتی کریا میں جناجاگرن پیچھے ڈھکیلتا ہے

یعنی رد عمل کے ذریعہ جو بیداری آئے، وہ قوم وملک کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ پیچھے کی طرف لے جاتی ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں بہت سے لوگ مسلمانوں کی رد عمل کی تحریکوں کو صحوہ اسلامیہ کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں بہت سے خوش فہم لوگ ہیں جو ہندوؤں کے درمیان مسلم رد عمل کے تحت اٹھنے والی لہر کو "ہندو بیداری" کا نام دے رہے ہیں۔ مسٹر باجپئی نے ایسے ہندوؤں کو آگاہی دی ہے کہ یہ ایک منفی بیداری ہے، اور منفی بیداری ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتی ہے، وہ تعمیر کا سبب نہیں بنتی۔

کوئی شخص خواہ کتنے ہی بڑے سیاسی عہدہ پر ہو، اس کو کبھی بے قید اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ جنرل محمد ضیاء الحق ساڑھے گیارہ سال (۸۸ — ۷۷ ۱۹) تک پاکستان کے مطلق حکمراں رہے۔ مگر پاکستان کی جو طاقتیں ملک کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہیں، ان میں سے کسی ایک پر بھی وہ ہاتھ نہ ڈال سکے ——— مثلاً بڑے بڑے جاگیردار، اسمگلر، منشیات اور ہتھیاروں کا کاروبار کرنے والے، بیوروکریسی، رشوت لینے اور دینے والے، ٹیکس کی چوری کرنے والے، علاحدگی پسند سیاست داں، وغیرہ

میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی وزیر یا حکمراں ہندستان کے اس مسئلہ کو حل کرسکتا ہے جس کو نہرو نے "ہندو فرقہ پرستی" کہا ہے۔ ہندو فرقہ پرستی تمام تر مسلم فرقہ پرستی کا رد عمل ہے، اور یہ صرف مسلمان ہیں جو قرآن کے اصول کے مطابق، صبر اور اعراض کی پالیسی اختیار کرکے اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کرسکتے ہیں۔

ہندستان کے مسلمان اس "ہندو فرقہ پرستی" کے جواب میں آج بھی ٹھیک وہی طریقہ

اختیار کیے ہوئے ہیں جو انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے مسلم لیگی لیڈروں کی رہنمائی میں اختیار کیا تھا۔ یعنی ہندو فرقہ سے براہ راست لڑنا، اس کے خلاف ایجی ٹیشن کرنا، اس کی مذمت میں اپنے تمام الفاظ خرچ کر دینا۔

۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں نے جو سیاست اختیار کی، اس کے تجربہ نے بتایا کہ مذکورہ بالا قسم کی جوابی تحریک صرف فرقہ پرستی کے مسئلہ کو بڑھاتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اسے کم نہیں کرتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ سے پہلے جس درجہ کی ہندو فرقہ پرستی سے دوچار تھے، آج اس میں سو گنا زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، ایسی حالت میں سابقہ پالیسی پر قائم رہنے کا آخر کیا جواز ہے۔ کیا مسلمان ایک بل میں دو بار ہاتھ ڈال کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث کے مطابق، ان کو مومنانہ بصیرت حاصل نہیں، وہ سرے سے ایمان کی روشنی ہی سے محروم ہیں۔

مدعو نہ کہ حریف

مسلمانوں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہندستان کی فرقہ پرستی کا واحد حل وہی ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ یعنی صبر اور اعراض۔ مسلمانوں کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں گے، وہ ہر حال میں ردّ عمل کی روش سے بچیں گے۔ یہی پہلے بھی ان کے مسئلہ کا حل تھا اور آج بھی یہی ان کے مسئلہ کا حل ہے۔ اس کے سوا وہ تدبیریں جو ان کے بے ریش اور باریش رہنما ان کو بتا رہے ہیں، وہ صرف ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہیں۔ وہ ہرگز منزل کی طرف لے جانے والی نہیں۔

مسلمان اب تک ہندوؤں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھتے رہے ہیں۔ ان کا یہ رویہ سراسر باطل ہے۔ وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے۔ مسلمان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اس ملک میں خدا کے دین کے داعی ہیں۔ ہندو ان کے لیے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ مدعو اپنے داعی کا محبوب ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہندوؤں کے تئیں اپنے نفرت کے جذبات کو کھرچ کر نکال دیں۔ اور ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ معاملہ کریں۔ یہی ان کے سارے مسائل کی کنجی ہے۔ یہی ان کی منزل کا آغاز ہے اور یہی ان کی منزل کا اختتام بھی۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو جو انگریزی الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے اپنے چار صفحہ کے

ط میں اپنا تبصرہ روانہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ میں ایک پیدائشی ہندو ہوں مگر میں کسی بھی مذہب
یں عقیدہ نہیں رکھتا۔ خواہ وہ ہندو مذہب ہو یا اور کوئی مذہب۔ البتہ میں انسانیت اور انسانی
شرافت کا دل سے قائل ہوں۔ وہ مزید لکھتے ہیں :

A large number of Hindus are orthodox and they are routinely busy making money and performing rituals and ceremonies for serving their selfish ends, at the same time trying to "buy" a berth in *swarg* in the next world. And because they have lots of material possessions, they know they will stand to lose much in consequence of riots. But when they are goaded to the end of their tether by other communities, they sometimes let their resentment erupt but not for a long period of time.

K.L. Dutta, W. 6/110, Premnagar, Dehra Dun

ہندوؤں کی بڑی تعداد کٹر مذہبی ہے مگر وہ صبح و شام پیسہ کمانے میں مشغول رہتے ہیں۔
ور رسوم و روایات کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں تاکہ اپنے خود غرضانہ مقاصد کو پورا کر سکیں۔ اور اسی کے
ساتھ اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ وہ دوسری دنیا میں سورگ میں اپنے لیے ایک جگہ
ریدسکیں۔ ان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ فساد جیسی پرتشدد چیزوں میں حصہ لیں۔ اور چوں کہ
ن کے پاس مادی سازوسامان کافی موجود ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ فسادات کے نتیجہ میں وہ
ہت کچھ کھودیں گے۔ مگر جب وہ دوسرے فرقوں کی طرف سے آخری حد تک چھیڑ دیے جاتے ہیں
بعض اوقات ان کی ناراضگی ابل پڑتی ہے۔ مگر بہت زیادہ دیر تک کے لیے نہیں۔

مسٹر کے ایل دتہ کے اس نقطۂ نظر سے میں متفق ہوں۔ ہندو بنیادی طور پر ایک تاجر پیشہ
م ہیں۔ اور فساد اور اس کے نتیجہ میں کرفیو کا سب سے زیادہ نقصان تاجر طبقہ ہی کو پہونچتا ہے۔
ں لیے اصولی طور پر ہندو، بحیثیت قوم، فساد کو پسند نہیں کر سکتے۔

پھر فساد کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو سب کے سب تاجر نہیں ہیں۔ ان میں
ک طبقہ غیر تاجروں اور غریبوں کا ہے۔ یہی دوسرا طبقہ اکثر اوقات فساد کا ابتدائی سبب بنتا
ہے۔ اس دوسرے طبقہ کا کوئی فرد ایک مسلمان کے ساتھ کوئی اشتعال انگیز کارروائی کرتا ہے،
ر ایسا ہونا کسی آزاد سماج میں بالکل فطری ہے۔ اس وقت مسلمان بے برداشت ہو جاتا ہے۔
اشتعال انگیزی کی صورت میں مشتعل ہو کر لڑنے لگتا ہے۔

اس کے بعد خود مسلمانوں کی دو قومی سیاست کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ دو فرد کا مسئلہ دو قوم کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دونوں طرف کے لوگ اپنی اپنی قوم کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں قومی شکایات جو سوئی ہوئی تھیں، اچانک جاگ پڑتی ہیں۔ قومی ساکھ اور قومی حمیت کا مسئلہ بن جانے کی وجہ سے دونوں فرقوں میں سے کوئی شخص یہ ہمت نہیں کرتا کہ وہ اپنے فرقہ کے خلاف بولے۔ تمام لکھنے اور بولنے والے یک طرفہ طور پر اپنے فرقہ کی حمایت اور دوسرے فرقہ کی مذمت شروع کر دیتے ہیں۔ قومی حمایت کا یہی انداز ہندو بھی اختیار کرتے ہیں اور یہی انداز مسلمان بھی۔

اب فرقہ وارانہ فساد کو ختم کرنے کی تدبیر صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان پورے عزم کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں صرف اعراض کی پالیسی اختیار کریں گے نہ کہ لڑنے اور مقابلہ کرنے کی پالیسی۔

اگر مسلمان پوری طرح یہ فیصلہ کر لیں تو یقینی طور پر وہ فساد کی جڑ کاٹ دیں گے۔ اس کے بعد ہر چنگاری اپنے ابتدائی مرحلہ میں بجھ کر رہ جائے گی، وہ فساد اور قتل و خون کے مرحلہ تک نہ پہونچے گی۔ جہاں بھی مسلمانوں نے اعراض کا طریقہ اختیار کیا ہے، وہاں لازمی طور پر ایسا ہی پیش آیا ہے۔

مسلمان اگر پوری طرح اعراض کی پالیسی اختیار کر لیں تو ابتدائی اشتعال کا ہر واقعہ صرف ایک شخصی واقعہ بن کر رہ جائے گا۔ وہ دو قوموں کے وقار کا مسئلہ نہیں بنے گا۔ اس کے بعد پولیس سے بھی مسلمانوں کی شکایت ختم ہو جائے گی۔ پولیس مسلمانوں کے لیے اس وقت ظالم بنتی ہے جب کہ مسئلہ دو قومی صورت اختیار کر لے۔ دو قومی صورت اختیار کرنے کے بعد مسلمان پولس کی گولی کا نشانہ بنتے ہیں۔ لیکن اگر مسئلہ دو قومی نہ بنے تو وہ افراد پولیس کی گولی کا نشانہ بنیں گے جنھوں نے ابتدائی طور پر شرارت کی تھی۔

الرسالہ فورم

۲۲-۲۴ اکتوبر ۱۹۹۲ کو بھوپال میں علماء اور دانشوروں کا کل ہند اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں فاق رائے سے طے کیا گیا کہ الرسالہ مشن کے تحت ایک الرسالہ فورم قائم کیا جائے۔ اس کا مرکز دہلی میں ہو ر اس کی شاخیں ملک کے ہر شہر اور قصبہ میں قائم کی جائیں۔ الرسالہ فورم ایک غیر سیاسی فورم ہے۔ اس کا صدیہ ہے کہ تعمیری مزاج اور صحت مند سوچ رکھنے والوں کا حلقہ بنایا جائے۔ وہ ہر مسئلہ میں مثبت دامات کر کے یہ کوشش کریں کہ اجتماعی معاملات میں ٹکراؤ نہ ہو اور پرامن دائرہ میں مسئلہ کو حل کیا جا سکے۔

اس نمائندہ اجتماع نے تمام تعمیر پسند افراد سے اپیل کی ہے کہ وہ ہر مقام پر فورم بنائے اور مرکز دہلی سے ں کا الحاق کر کے اپنے اپنے یہاں یہ کام عملی طور پر شروع کر دیں۔ الرسالہ فورم حسب ذیل دائروں میں کام کرے گا۔

۱- دین حق کو حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ذریعہ موثر اسلوب میں عام لوگوں تک پہنچانا۔

۲- لوگوں میں اخلاقی بیداری لانا اور انسانیت دوستی کا مزاج پیدا کرنا۔

۳- لوگوں کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرنا۔

۴- معاشی حالت کو درست کرنے کی تدبیر اختیار کرنا۔

۵- لوگوں میں یہ مزاج پیدا کرنا کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہ سکیں۔

۶- باہمی جھگڑوں کو سمجھا بجھا کر ختم کرنا۔

۷- اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی تربیت کرنا۔

۸- فضول خرچی کو روکنا اور سادہ زندگی کو رواج دینا۔

۹- احتجاجی سیاست کے بجائے تعمیری سیاست کو فروغ دینا۔

۱۰- ہندو مسلم تعلقات کو بڑھانا اور باہمی اشتراک کی صورتیں اختیار کرنا۔

۱۱- فرقہ وارانہ مسائل میں جذباتی قیادت کی جگہ حقیقت پسندانہ قیادت وجود میں لانا۔ اور پریس اور پلیٹ فارم کی سطح پر مسلمانوں کی نمائندگی کو نیا تعمیری رخ دینا۔

وری اسباب کے تحت الرسالہ کے خصوصی نمبر "علماء اور دور جدید" کی اشاعت ملتوی کر دی گئی ہے۔ اس کو انشاء اللہ آئندہ شائع کیا جائے گا۔ (منیجر الرسالہ)

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

الاسلام	
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	[illegible]
عظمت صحابہ	[illegible]
دین کامل	60/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات	60/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	40/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	20/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسول	30/-
ڈائری جلد اول	60/-
ڈائری جلد دوم	[illegible]
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	[illegible]
سفرنامہ (اسپین و فلسطین)	[illegible]
میوات کا سفر	30/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-

[illegible]	20/-
تعمیر کی طرف	[illegible]
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	[illegible]
دین کیا ہے	[illegible]
اسلام دین فطرت	[illegible]
تعمیر ملت	[illegible]
تاریخ کا سبق	[illegible]
فسادات کا مسئلہ	[illegible]
انسان اپنے آپ کو پہچان	[illegible]
تعارف اسلام	[illegible]
اسلام پندرہویں صدی میں	[illegible]
راہیں بند نہیں	[illegible]
ایمانی طاقت	[illegible]
اتحاد ملت	[illegible]
سبق آموز واقعات	[illegible]
زلزلۂ قیامت	[illegible]
حقیقت کی تلاش	[illegible]
پیغمبر اسلام	[illegible]
آخری سفر	[illegible]
اسلامی دعوت	[illegible]
خدا اور انسان	[illegible]
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	[illegible]
دینی تعلیم	[illegible]
حیات طیبہ	[illegible]
باغ جنت	[illegible]
نار جہنم	[illegible]
[illegible]	10/-
رہنمائے حیات	[illegible]
[illegible]	—
[illegible]	[illegible]

	روشن مستقبل	[illegible]
	صوم رمضان	[illegible]
	علم کلام	[illegible]
	صداقت اسلام	—
	علماء اور دور جدید	—
	ہندستانی مسلمان	[illegible]
	سیرت رسول	
	اسلام ایک عظیم جدوجہد	[illegible]
	ہندستان آزادی کے بعد	[illegible]
	مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	[illegible]
	اسلام کا تعارف	[illegible]
	سچائی کی تلاش	[illegible]
	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	
	الاسلام (ہندی)	85/-
	الاسلام	65/-
	[illegible]	
	[illegible]	
A-1	حقیقت ایمان	25/-
A-2	حقیقت نماز	25/-
A-3	حقیقت روزہ	25/-
A-4	حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقت حج	25/-
A-6	سنت رسول	25/-
A-7	میدان عمل	25/-
A-8	[illegible]	25/-
A-9	اسلامی دعوت	25/-
	[illegible]	
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحاد ملت	25/-
A-12	تعمیر ملت	25/-
A-13	[illegible]	25/-